اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

پیامِ اقبالؒ

یعنی

شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے ہنگامہ خیز اور حیات افروز کلام پر زبانِ اردو میں سب سے پہلی اور سب سے زیادہ جامع و مانع کتاب: بصائر و حکم کا ایک بیش بہا گنجینہ، دین و سیاست کا مکمل دستور العمل اور اخلاقیات کا نادر الوجود صحیفہ!

مرتبہ و مؤلفہ

شیخ عبد الرحمٰن طارق بی۔ اے

قیمت

دس روپے

ناشر

چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی ۶

مطبوعہ

سٹوڈیٹو پریس، دہلی

اِنتساب

حکیمِ مشرق کی برگزیدہ یاد میں خونِ جگر کے یہ چند قطرات روحِ اقبالؒ کے حضور میں پیش کرتا ہوں!

اقبالؔ کی ناگہاں وفات میری جانِ حزیں پر بجلی بن کے گری، رنج والم کا اک طوفان دل میں بپا ہوا۔ اور آنکھوں سے گریۂ مسلسل کے تار بندھ گئے۔ مگر غیب سے یکایک آواز آئی ——— "خاموش! آج میری پیدائش کا دوسرا شاندار دن ہے، اس لئے کہ میں نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہی دنیا والوں کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے کھول دی ہیں!

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بر بست و چشمِ ما کشاد"

طارق

فہرست مضامین

دیباچہ

جنابِ خواجہ دل محمدؐ صاحب ایم۔ اے

پروفیسر اسلامیہ کالج، لاہور

اقبال دورِ حاضر کا وہ باکمال شاعر ہے جس کی شاعری صرف شاعری نہیں، بلکہ ایک مقصدِ عظیم کی حامل ہے، وہ شاعر ہے اس کے حرف حرف میں رنگینیاں مسکراتی ہیں اور لفظ لفظ میں رعنائیاں جھلکتی ہیں۔ کہیں اس کی حساس طبیعت حُسن کی پیامبری کرتی ہے، کہیں اس کا پاکیزہ تخیل فطرت کے اسرار تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ فلسفی ہے جو رازِ نہانِ ہستی کی جھلک دکھا کر تجلّی خانہ دل کو منوّر کرتا ہے۔ اور تخیّلات کی لا محدود جولانیوں سے عالمِ بالا کی پرواز دکھاتا ہے۔ فنا و بقا کے معمّے، حیات و ممات کے کرشمے، نیرنگِ شہود، جلوہ ہائے شاہدِ مشہود، اس کی طبعِ روشن کے سامنے آئینہ ہیں۔ وہ مصلح ہے۔ اس کی صدا نوا ریز، اور نوا درد انگیز ہے۔ اس کا پیام پیامِ حیات ہے، اس کے اشکِ جگر زاد وہ تابدار موتی ہیں۔

جن کی قیمت گوہر شناسانِ عالم کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ شاعرِ انقلاب ہے۔ جو الفاظ کی دل نشینی اور معانی کی جگر تابی سے گولہ بارود کا کام لے کر طبائع میں ایسا ہیجان پیدا کرنا چاہتا ہے، جو غلاموں کو آزاد اور خاکساروں کو تاجور بنا دے۔ وہ قرونِ اولیٰ کی سادگی اور صدقِ خلوص کا فریفتہ ہے اور نوجوانوں کو فریبِ مغرب کی تباہ کاریوں سے بچانا اور تصنّع سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔

ایسے شاعرِ باکمال کو کماحقہٗ سمجھنا اور اس کے پیام کی ترجمانی کرنا ہر کرومہ کا کام نہیں، چاند کا عکس سمندر میں دریا میں ندی میں حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے نالابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مگر ان میں سے ہر شے کا اکتسابِ نور اس کے اپنے ظرف اور صفائے باطن پر موقوف ہے۔ آفتاب اپنی انتہائی تجمل آرائی کے ساتھ صبح کے وقت تمام چرند پرند اور حیوانات کے لئے پیامِ بیداری لاتا ہے۔ مگر چغد و بوم اسے دیکھ کر تاریکی کی طرف بھاگتے ہیں۔ آسمان سے بارانِ رحمت برستی ہے، مردہ زمینیں اسے قبول کر کے نہال ہو جاتی ہیں، سبزہ ہر طرف لہلہانے لگتا ہے، پھول کی رنگینیاں انسانی اعداد و شمار سے تجاوز کر جاتی ہیں. مگر شور زمین۔ ہے کہ کفِ دست کی مانند ویران پڑی ہے، کوئی پیداوار نہیں، کوئی شگفتگی نہیں، کوئی آثارِ حیات نہیں، یہی حال انسانوں کی مختلف طبائع کا ہے، شاعر کے کمال اور اس کے پیام سے صرف وہی لوگ متمتع ہوتے ہیں،

جن کو فطرت نے طبع حساس دی ہو اور دل و دماغ میں جوہرِ قابل ودیعت کیا ہو۔

شیخ عبدالرحمٰن صاحب طارق ملک کے وہ نوجوان اور ہونہار فرزند ہیں جنہوں نے صانع ازل سے کسبِ فیض اور ادراکِ معانی کے لئے قابل دماغ پایا ہے، ان کی موجودہ تصنیف یعنی "پیامِ اقبال" کو میں نے جستہ جستہ مقامات سے دیکھا ہے، شاعر نے اپنے کلام میں لامحدود ذخائر کو ڈھیر کر دیا ہے، لیکن جناب طارق نے اُن ذخائر کو ایک ضابطہ اور نظام کے ماتحت ترتیب دے دیا ہے، اُن کے تجویز کردہ عنوانات میرے قول کی تصدیق کریں گے۔ حفظِ خودی، ضبطِ نفس، دعوتِ عمل، فلسفہ ہجر، تجدید آرزو، وطنیت، اخوتِ اسلامیہ، مساوات، تہذیبِ حاضر، اور حقیقتِ موت وحیات وغیرہ اس قسم کے عنوانات ہیں جن کے متعلق اقبال نے اپنی فارسی اور اُردو تصانیف میں مختلف مقامات پر مختلف اشعار کہے، لیکن یہ مہم قابلِ صد تحسین ہے کہ اُن اشعار تابدار کو مسلسل غور وخوض کے بعد عنوانات مختلفہ قائم کرتے ہوئے جناب طارق نے ایک باضابطہ اور منظم شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اس کے لئے محنت شاقہ اور کاوش کی ضرورت تھی، یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ اقبال کے وہ کون کون سے مخصوص اور معرکتہ الآرا جذبات د

احساسات ہیں۔ جن کا اظہار اس نے اپنی زندگی کے مختلف اوقات میں کیا ہے۔ اور جنہیں وہ قوم کے فکری، عملی، یا معاشرتی پہلوؤں کی اصلاح کے لئے نہایت ضروری سمجھتا ہے۔

ہمیں جناب طارق کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ ان کی کاوش سے آج ایسی حیات افروز، مفید اور باضابطہ کتاب "پیامِ اقبال" کے نام سے موسوم ہو کر ہمارے سامنے آئی ہے۔ اس تصنیف کی ہم جتنی قدر کریں کم ہے۔

مجھے ابھی چند باتیں اس کتاب کے اندازِ تحریر کے متعلق عرض کرنا ہیں۔

تحریر ایک ایسا ملکہ ہے جس کے لئے مندرجہ ذیل لوازمات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ الفاظ کی انفرادی اور اجتماعی موسیقی

۲۔ معانی کی بلندی اور تخیل کی رفعت

۳۔ اندازِ تحریر کی روانی

۴۔ مضامین کا باہمی ربط و ضبط

۵۔ زور اور دبدبہ

۶۔ الفاظ کا ایسا استعمال جس میں اُن کے مفہوم کی ہیبت یا نرمی فقط ان کے تلفظ یا ظاہری شکل و شباہت ہی سے ظاہر ہو جائے۔

پھر یہ چیزیں بھی حاصل نہیں کی جا سکتیں تاوقتیکہ طبیعت میں مندرجہ ذیل خصائص نہ پائے جاتے ہوں۔

١۔ فنونِ لطیفہ سے پیدائشی اُلفت
٢۔ کتابِ فطرت کا عمیق مطالعہ
٣۔ نفسیات کی پوری پوری مہارت
٤۔ جودتِ طبع
٥۔ مذاق کی سلامتی
٦۔ نظر کی وسعت
٧۔ احساسات کی پاکیزگی

سوال تو یہ ہے کہ جب تک ایک شخص کی نظر ذاتی طور پر اتنی بلندی تک نہ جا سکے جتنی کہ شعر کہتے وقت اُس شاعر کی نظر بلند تھی، جس پر وہ شخص تنقید کر رہا ہے یا اگر اِس شخص کے خیالات اور احساسات میں اس تقدس، رفعت، تلاطم، اور جذبۂ اخلاص کو سمجھنے اور قبول کرنے کا ملکہ نہ ہو۔ جو شاعر کی طبع عالی کے خصائص ہیں تو وہ اشعار کے معانی اور نکات تک کیونکر رسائی حاصل کر سکتا ہے؟ اور یہ شے نہ ہوئی۔ تو تنقید و تبصرہ کا فائدہ کیا؟ یہ ہے وہ نقص جو عام طور پر تنقیدی کتب کو اُس بلندی تک پہنچنے نہیں دیتا۔ جہاں تک اُن کو پہنچنا چاہیئے۔

جناب طارق کی تصنیف ماشاء اللہ ایسے عامیانہ نقائص سے

بہت بلند ہے، قابل مصنّف کو علم و حکمت کے مطالعہ سے خاص شغف حاصل ہے۔ اور اس کی تحریر میں بجائے خود قابل قدر" روانی" اور" قوت" پائی جاتی ہے۔ اُن کی تحریر جگہ جگہ حکیمانہ لطائف سے لبریز ہے۔ جن کی وجہ سے ان کی نثر بھی اکثر جگہ" شاعرانہ" خصوصیات کی حامل بن گئی ہے۔

اقبال جیسے مشکل پسند اور دقّت نگار فلسفی کو سمجھ کر اس کے کلام کا ایسا بصیرت افروز تعارف باشندگانِ ہند کے سامنے پیش کرنا بجائے خود غیر معمولی ہمّت کا کام ہے، ان کا جدید رنگ اور تشریحی مثالوں کی موزونیت اور برجستگی واقعی اس قابل ہے کہ اسے بہ نظر استحسان دیکھا جائے۔

میں خود" پیامِ اقبال" جیسی تصنیف پر جناب طارق کی خدمت میں دلی مبارکباد عرض کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ ملک کا تمام صاحبِ ذوق اور علم دوست طبقہ ان کی اس بیش بہا تصنیف کا پوری گرمجوشی سے استقبال کرے گا۔

۳۰ جنوری سنہ ۱۹۳۸ء

دل محمد دلؔ ایم، اے
اسلامیہ کالج۔ لاہور

خالقِ موجودات کو فکر تھی

روزِ ازل خالقِ موجودات کو یہ فکر تھی کہ کائنات کا اتنا عظیم الشان سلسلہ قائم کرنے کے بعد اگر کوئی ایسی شے وجود میں نہ لائی گئی، جو میری تمام صفات کی ترجمان ہونے کے علاوہ روح میں فرحت طبیعت میں جودت، مزاج میں گرمی، احساس میں صداقت، نظر میں تنویر اور باہمی تعلقات میں محبت والفت پیدا کرنے کا باعث ہو، تو بےچارے انسان زندگی کی حقیقی لطافت سے محروم رہ جائیں گے۔

چنانچہ اسی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس نے شعاعِ آفتاب سے حرارت لی، چاند سے خنکی اور تنویر کا عنصر مہیا کیا، برق سے تڑپ اور بےقراری مانگی، ستاروں سے تبسم حاصل کیا، آبشاروں سے موسیقی پائی، زلف سے پیچیدگی اور لچک حاصل کی، باغِ ارم کے شگفتہ چمن سے تازہ بتازہ کھلے ہوئے پھولوں کی نکہت اخذ کی، شفق سے رنگینی لی۔ لالے سے داغِ جگر مانگا، شبنم سے رفعتِ پرواز کا اشارہ پایا ——— شباب سے امنگ اور کسی حسین

کے پیکرِ جمال سے شعریت حاصل کی، خرامِ ناز سے ارتعاش اور حیرت کے ضروری تاثرات پیدا کئے اور ان تمام چیزوں کے اجزائے ترکیبی سے جو شئے تیار ہوئی، اُسے "شعر" کا برگزیدہ خطاب عطا کیا گیا۔

شعر آدم کے حق میں خدا کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔ شعر نہ ہوتا تو حیاتِ انسانی کیف و وجدان سے بالکل عاری تھی۔ پھول مرجھاتے، سبزہ زار جل کر راکھ ہو جاتے، پرندوں کو نغمہ سرائی کی بجائے اداسی لگی رہتی، آبادیاں ویران و برباد دکھائی دیتیں اور انسان اس کے بغیر بجائے خود وحشت و بربریّت کی زندگی بسر کرتے، شعر آدم کے حق میں خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

طارق بی۔ اے

حمد و ثنا[۱]

اے آسمانی بادشاہ! میں تیرا شکریہ کیونکر بجا لاؤں۔ کہ تو نے اپنی ہیبت اور جلال سے ہمیں زندگی کی حقیقی سعادت بخشی!

اے خدا! رحم بے شک ایک اچھی شے ہوگا۔ لیکن میں تو تیرے قہر کو اس سے بھی کہیں زیادہ مفید پاتا ہوں! لوگ تیری طرف سے نرمی اور محبّت کی تلاش کرتے پھرتے ہیں، لیکن میں سختی اور تشدد کا خواہاں

---

[۱] یہ حمد و ثنا ایک ایسے انوکھے انداز میں لکھی گئی ہے کہ ناظرین اسے دیکھ کر شاید متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ لیکن آپ حضرات کو یاد رہے کہ اس میں تعجب کے ساتھ صداقت اور واقعیت کا رشتہ ہاتھ سے نہیں دیا گیا۔ بنی آدم کی غیر متناہی فتونوں کا ذکر ہے اور اس میں مبالغہ کو ذرہ برابر دخل نہیں، اکثر جگہ بیان گو شکایت آمیز ہے لیکن اس شکایت میں بھی انس و الفت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جرأت اور حوصلہ افزائی کی رو سے بھی تلقین و تادیب کا اس سے بہتر پیرایہ ناممکن تھا۔

طارق

ہوں! میرے نزدیک تیرا غصّہ اور غضب تیری شفقت سے کہیں زیادہ عزیز ہے!

لوگ بجلی کی کڑک سے سہم جاتے ہیں، حالانکہ میں اس وقت بے اختیار ہنس دیتا ہوں اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری ایک گم گشتہ شئے پھر سے میرے ہاتھ لگی ہے۔

لوگ ہلال عید کو دیکھ کر مسرت سے پھولے نہیں سماتے، لیکن میں جس چیز کو دیکھ کر مطمئن ہوتا ہوں وہ تیرا عریاں اور غضبناک "خنجر" ہے۔

میرے حال پر مہربانی فرما، اور ان بھیڑ کے بچوں سے مجھے محفوظ رکھ۔ گیدڑوں کو مجھ سے دُور لے جا، جو چیز میرے دل کو زندہ اور بیدار رکھتی ہے۔ وہ بھرے شیروں کی لرزا دینے والی گرج ہے اس لئے میرے کھیل کود کے لئے تو فقط شیروں کی ٹولیاں فراہم کر!

کیوں کہ آج کے بعد میرا کھانا عقاب کا گوشت اور میرا پینا شیر کا خون نہ ہو؟ کیوں میں شیر کی کھال کے علاوہ کوئی دوسری چیز زیب تن کروں؟ کیوں میں نرم و نازک بستر کی بجائے کانٹوں اور سنگریزوں کو اپنا بچھونا قرار نہ دے لوں؟ کیا اس سے زیادہ بھی کوئی چیز قدرتی ہو سکتی ہے؟

تُف ہے۔ ایسے تمام تکلفات پر جن کا مسلسل استعمال جسم کو

مردہ اور طبیعت کو افسردہ بنا دے!

تو میرے سامنے قیامت کا ذکر کرتا ہے، بالکل ٹھیک، تیرا فرمان اور میرا ایمان کوئی دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، لیکن میں چاہوں تو اپنی ایک ٹھوکر سے ایسی ایسی سینکڑوں قیامتیں بہ پا کر سکتا ہوں میرا فقط جنبش میں آجانا تیرے اس تمام کارخانے کو درہم برہم کر دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔ میری ہر نگاہ سے آسمان بھی خوف و ہیبت کے ساتھ تھرتھرانے لگتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ الٰہی! یہ زلزلہ کہاں سے آیا اور کس شے نے اس کو پیدا کیا؟

جنہیں تو پہاڑ کہتا ہے، وہ میرے کوڑے کی شدّت ضرب سے لرزہ براندام ہیں۔ گویا ابھی ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں ہر طرف بکھر جائیں گے۔!!

پہاڑوں کی بھلا کیا حقیقت ہے، تیری تمام پیدا کردہ مخلوق یہ زمین، یہ آسمان، یہ دریا اور یہ فضا، ان میں آباد رہنے والی جملہ اشیا اور ایسی ایسی سینکڑوں دنیائیں میرے گوشۂ دل میں ایک نقطۂ پرکار کی طرح "محو" ہو گئی ہیں!

اے خدا! تیری وحدت اور یکتائی کی قسم اگر میری آنکھ غم و حسرت کی وجہ سے کبھی ایک آنسو بھی بہائے۔ تو اس کی بینائی ہمیشہ کے لئے چھین لے، اگر میری زبان کبھی نالہ و فریاد پر اتر آئے تو اسے کاٹ کر کتّوں کے سامنے پھینک دے۔ اگر میری ٹانگیں

کسی وجہ سے کانپنے لگیں، اور منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے سے گریز کریں تو انہیں ایسا معطّل کر کر آیندہ کے لئے وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکیں، اگر میرا دل ایک لمحہ کے لئے بھی مایوس ہو، اور خوف زدہ ہونے لگے، تو اس کو ایسا خاموش کر دے کہ تا قیامت جاگنے نہ پائے ــــــ اور اگر میں یقین اور امید کا رشتہ کبھی ہاتھ سے دے بیٹھوں تو دوزخ کی تمام آفتیں مجھ پر مسلط کر دے!

تو خود سراپا یقین ہے! تیری اپنی تکوین سراسر غلبے اور اقتدار سے ہوئی! پھر اگر میں ان صفات کو عمل میں نہ لاؤں، اور غفلت سے کام لوں، تو مجھے کیوں ان تمام سزاؤں کا مستحق نہ سمجھا جائے؟

اے خدا! کسی ایسے شخص کو میرے پاس بھیج جو مایوس ہو، اور اپنی مصیبت کی داستانیں رو رو کر بیان کرتا ہو، میں اس کی کھال کو، خوفناک طریق پر ادھیڑ دوں گا۔ اس کا ایک ایک عضو کاٹ کر آگ میں پھینک دوں گا، اس کے جسم کو نیزوں اور برچھیوں سے چھلنی کروں گا، اور اُسے ایسی ایسی عبرتناک سزائیں دوں گا، جو زمانہ میں یادگار ہیں!

مسلمان! آج کتنے رسمی اور نام نہاد "مسلمان" ایسے ہیں، جو خائف اور نا اُمید ہونے کی وجہ سے حقیقت میں کافر اور زندیق ہیں، میں ایسے لوگوں کو مسلمان نہیں کہتا، وہ ننگِ انسانیت ہیں!

کافر! کتنے لوگ ایسے ہیں جو محض آبائی تقلید اور ماحول کے اثر سے رسماً کافر کہلاتے ہیں، لیکن وہ بے خوف، دلیر اور اُمیدوار

ہونے کی وجہ سے سچے مومن ہیں، اور بزدل انسان! یادرکھو کہ فطرت کی نظر میں اسلام اور ایمان کا صحیح معیار دلیری اور یقین ہے! یہاں غلط خطابات ہرگز مفید نہیں ہو سکتے!

اے خدا! تیری ان بے شمار نعمتوں میں سے مجھے فقط ایک چیز پسند آئی ہے، اور اُسی کو میں نے انتخاب بھی کیا ہے، وہ میری زہرہ گداز شمشیر ہے، جس کی ایک جھلک بدخواہ لوگوں کے خرمنِ ہستی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے، اسے سلامت رکھ!

اے خدا! کیا تو دیکھتا نہیں کہ میرے سینے اور پیشانی پر ہنوز خون کے داغ دکھائی دے رہے ہیں، میرا تمام جسم لہو لہان ہے، ڈھال کٹ کر دو ٹکڑے ہو چکی ہے، زرہ اکثر جگہ سے چاک چاک ہو گئی ہے۔ خود اچھل کر دور جا پڑا ہے، وہ مہیب اور بھاری خنجر، وہ آفت اور ہلاکت کا اژدہا جس نے سینکڑوں کے خون پیے ہیں، اب مستی کی وجہ سے حرکت نہیں کر سکتا، میرے دیو جیسے شانے مسلسل ضربات سے پھول گئے ہیں۔ آنکھیں شعلہ ریز ہیں، اور گھوڑا تھک کر پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ لیکن بایں ہمہ میں دلیری کے ساتھ سینہ سپر ہوں، اور اس بہتے ہوئے خون کو عطر و گلاب کی طرح قیمتی اور فرحت ناک سمجھتا ہوں!

تو نے اس عرصۂ کارزار میں شیطان جیسی ذلیل اور کمزور ہستی کو میرا حریف بنا کر بھیجا، گو اُس نے میرے ساتھ بہت سے دھوکے

اور فریب کئے۔ لیکن اُس کے یہ تمام وار میرے جسم آہنیں پر پھول ہو کر برستے رہے۔ بالآخر میں نے جو رُخ بدلا، تو ایک ہی حملہ میں اس کا کام تمام کر دیا، وہ دیکھ' اس کا نفرت انگیز اور مکروہ لاشہ زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ اپنے کارکنوں سے کہ اس کو میرے سامنے سے اُٹھا کر لے جائیں۔ ایسی کمزور اور خفیف شے کی نسبت تو نے ایک چڑیا ہی کو میرے شکار کے لئے کیوں نہ بھیج دیا؟

آہ! آگ اور خون کا یہ بھڑکتا ہوا سمندر! اور اس کی تواضع کے لئے گھاس کے یہ دو چار تنکے! ہائے افسوس، یہ کسی جادوگر کا جھوٹا طلسم تو نہ تھا جس کی اس قدر توہین کی گئی!

بے شک میں فرعون کا حامی نہیں' بے شک میں ہلاکو اور چنگیز جیسے ظالم اور جابر لوگوں کی تائید نہیں کر سکتا، لیکن اگر ضرورت پیش آئے۔ تو اے خدا! خالدؓ اور حیدرؓ کا خون آج بھی میری رگوں میں موجزن ہے' اور صلاح الدین ایوبیؒ کی روح آج بھی میرے جسم کے اندر تڑپ رہی ہے!!

اے خدا! تو خود نازو ادا سے فرشتوں کو اپنے گرد لے کر عرش کے حجلۂ عروس میں جا پوشیدہ ہوا' وہ تیری خوشامد کرتے ہیں اور تو اُسے سُن سُن کر مسرور ہوتا ہے۔ اور جس آدم کو تو نے جلا وطن کر دیا تھا' اس کا سیلاب آج طوفان نوح بن کر تیرے عرش کی جانب بڑھ رہا ہے' اس کی بے تابی اور وسعت کو آج کون سنبھالے گا؟

روزِ آفرینش تیرا یہ خیال تھا۔ کہ شاید میں آدم کو "موت" جیسے اندوہناک حادثہ سے مغلوب کر سکوں گا، سب سے بڑھ چڑھ کر تیرے پاس یہی ایک آلۂ کار تھا، جس سے تو نے آدم کے احساسات کو تلخ کرنا چاہا، میں اس راز سے بہت اچھی طرح واقف ہوں، لیکن تجھے معلوم ہے کہ وہ اس "نقشِ خیالی" سے ذرہ برابر بھی مرعوب ہوا؟

موت! اگر تو نے اس زمین پر نزول کیا، تو آ، بڑی خوشی سے آ، میں تیرا استقبال کروں گا، میری آرزو تو کسی زیادہ مہیب شئے کی تاک لگائے بیٹھی تھی، لیکن تو مجھے ایک دلہن سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے، تیرا سر اور چہرہ پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ آ اور مجھ سے ہمکنار ہو جا، تیری آغوش میں میرا دوام ہے۔

اے خدا! زندگی کس قدر قیمتی ہے اور موت کو کس طرح پامال کیا جاتا ہے، اگر میں جیتے جی ان ہر دو باتوں کا ثبوت اس شان سے پیش نہ کروں جسے دیکھ کر تو بھی مرحبا پکار اٹھے تو مجھے اس ہوا میں سانس لینا حرام ہے!

اے خدا! یہ دنیا کس قدر خوبصورت اور نظر فریب ہے، غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی چشم آلود اور قہرمان سرخیوں سے بھی زیادہ ستاروں کے روشن اور جگمگاتے ہوئے کارواں سے بھی زیادہ، ہمیشہ گردش اور سیر و سفر میں رہنے والے چاند سے بھی زیادہ، کوہکن کے خارا شگاف تیشے اور جوئے شیریں کی دلکش دھار سے بھی

زیادہ، توپوں کی مار اور ہتھیاروں کی جھنکار سے بھی زیادہ، میدان جنگ میں گھوڑوں کی ٹاپ اور سپاہیوں کی خوفناک چیخ و پکار سے بھی زیادہ، حق اور باطل کی معرکہ آرائی میں خون کی بہتی ہوئی لالہ رنگ ندیوں سے بھی زیادہ، الغرض تیری خاموش اور پُرسکون دنیا سے بھی زیادہ، لیکن تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس تماشاگاہ کی رونق اور آبادی کس کے دم سے ہے؟ ہاں وہ فقط میں ہوں اور میری بے پناہ قوت ہے، جس نے ان تمام فرائض کی بجاآوری کی اور تیری عزت کو فنا ہونے سے بچایا، اے انقلابِ زماں کے مبصر تاریخ میں اپنی پیش کی ہوئی اس کارگذاری کا غور سے مطالعہ کر!

مگر ہاں، ابھی کل ہی کی بات ہے۔ کہ آدم کی روح میرے سینہ میں چلائی اس کا لہجہ شکایت آمیز تھا، اس نے کہا: "یہ دنیا اب کس قدر پرانی اور یہ ایوان کس قدر بوسیدہ ہو چکا ہے، اس کی دیواریں بالکل گرنے کو ہیں، آسمان کی نیلی چھت میں ٹنگے ہوئے یہ روشن فانوس اب اپنی روشنی کھو چکے ہیں، اور دیگر اشیا بھی میرے لئے چنداں کشش نہیں رکھتیں، ہواؤں کی اُداس موسیقی اور کائنات کا مبہم انتشار آدم کے سکون پر طعنہ زن ہے، اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مردِ خدا پھر سے اس کی تعمیر کرے گا اور اس کی جنبش یہ گمشدہ رونق پھر سے یہاں لائے گی، ستارے اس خوشی میں اک بے پناہ رقص کریں گے اور ان کے رقص سے دنیا کا گوشہ گوشہ جگمگا اُٹھے گا۔"

میں نے کہا۔ کچھ ہرج نہیں، اگر دوسری تمام چیزیں مدھم پڑ چکی ہیں۔ تو "فطرت" کی روشنی اب تک باقی ہے۔ یہی تمام ضروریات کو مہیا کرے گی۔

پس اے خدا، اے میرے محسن اور مہربان آقا! اگر تو زندہ ہے، تو فقط میرے خون کی حرارت سے، اور اگر تیری ہستی کو تسلیم کیا جاتا ہے تو وہ بھی میرے یقین اور استقلال سے!

اس لئے میری آخری فریاد کو سُن، اور وہ یہ ہے کہ تو ہر دوسری چیز کو فراموش کر دے۔ بنی آدم کو اُسی شوق اور اُسی وقار کے ساتھ دیکھ جو اس کے لئے سزاوار ہے۔ فرشتوں میں بھی اُس کی عظمت اور اُسی کی ناقابلِ تسخیر قوّت کا اعلان فرما، یہ ناز تیرے لئے سب سے اچھا ہے اسی سے تیری زیبائش ہو گی۔ حوروں کے دل اور شہدا کی روحیں اُن نغمے کو سُنکر سیراب ہو جائیں گے، میری بن آتے گی، اور تیرا کچھ نہیں بگڑے گا!

طارق

دیباچہ

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

اقبال کی شاعری کو آج تک پڑھا تو بہتوں نے ہو گا۔ اس کی جگہ بہ جگہ تعریف بھی ہوئی ہو گی۔ اور اُس کی عظمت کو جلسوں اور محفلوں میں بڑی گرم جوشی سے تسلیم بھی کیا گیا ہو گا۔ لیکن یہ قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ لوگ اقبالؔ کی مصلحانہ اور پیغمبرانہ شان سے اب تک بے خبر ہیں، نہ صرف بے خبر ہیں، بلکہ وہ اس تعلیم کے عملی اور اخلاقی مقاصد کا تجزیہ بھی نہیں کر سکے!

میں آج آپ کو یہی سمجھانا چاہتا ہوں کہ اقبالؔ کن کن مقاصد کو لے کر ہمارے سامنے آیا، اس کا اصل موضوع کیا ہے اور نتیجہ کے طور پر وہ کن کن چیزوں کو بنی نوع انسان میں دیکھنے کا آرزومند اور متمنی ہے!

بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہوئی ہے کہ اقبال کسی خاص

سرزمین کو اپنی تعلیم ودیعت کرنا چاہتا ہے، اور اُس کا روئے سخن زیادہ تر اسلامی دنیا کی طرف ہے۔ جس سے اُس نے اپنے تاثرات کو بجائے وسیع اور غیر محدود بنانے کے مفید اور محدود بنا لیا ہے، لیکن یہ ایک ایسا خیال ہے، جسے محض خیال کہنا چاہیئے۔ اور جسے کوئی باخبر اور انصاف پسند شخص کسی صورت میں بھی صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا؟

اقبالؔ حقیقت میں "دنیا" کا شاعر ہے، اس کا وطن صرف ہندوستان ہی نہیں، بلکہ تمام روئے زمین ہے، وہ اپنی تعلیم اور اپنے فیض کے لئے کسی خاص قوم کو ہرگز مخصوص نہیں کرتا، بلکہ اُس کا خطاب "بنی نوع انسان" کی طرف ہے۔ وہ ایک ایسا معدن، یا ایک ایسا دریا ہے، جسے کوئی بھی کھود دے، یا کوئی بھی اُس میں غوطہ زن ہو، وہ بے تکلف اپنے موتی اور جواہرات اُس کی جھولی میں اُگل دے گا، وہ ایک ایسا آفتاب ہے، جس کی روشنی اپنے فرائض کی بجا آوری میں کسی قوم یا کسی گروہ کا امتیاز نہیں کرتی، وہ ایک ایسا دفتت بھر چشمہ ہے، جو سب کو یکساں طور پر سیراب کرتا، الغرض وہ بخیل اور تنگ دل نہیں، بلکہ سخی اور فیاض ہے۔

چنانچہ اُس کے تاثرات کا ایران، توران، افغانستان، ٹرکی اور روس وغیرہ سے گذر کر انگلستان، جرمنی اور فرانس تک پہنچ جاتا، اس حقیقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس کی تعلیم اپنے عملی اور اخلاقی

فوائد کے پیشِ نظر بنی نوعِ انسان کے لئے مشترکہ طور پر مفید اور سودمند ہونے کی کس قدر صلاحیت رکھتی ہے۔

لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ محض اس وجہ سے ہے کہ اقبالؔ فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بالاتر رہتے ہوئے "فطرت" ہی کو اپنے تمام بیانات کا واحد معیار قرار دیتے ہوئے ہے۔ اور فطرت ایک ایسی من بھانی شے ہے، جس سے دنیا کے کسی فرد کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑ پڑنا اور ان جھگڑوں کو طول دے دے کر قیامت سے جا ملانا، آج کل کے ملاؤں، جاہل صوفیوں، پنڈتوں، اور غیر ذمہ دار پادریوں کو مبارک ہو، جو شخص دنیا والوں کو فلاح و بہبود کا راستہ سجھانے والا ہو، اُس کے شایانِ شان نہیں کہ وہ ان بیہودہ اور پست چیزوں میں حصہ لیتا پھرے!

اقبالؔ تو یہ کہتا ہے کہ بجائے نرمی اور گوسفندی کے مضبوطی اور استحکام کا سبق سیکھو، جو مزا شیر کی طرح سینہ سپر ہونے میں ہے، وہ مزا لومڑی کی طرح سر نیوڑھا کر بیٹھ رہنے، یا گیدڑ کی طرح دم دبا کر بھاگ جانے میں نہیں ؂

دلبری بے قاہری جادوگری ست
دلبری با قاہری پیغمبری ست

وہ ہمیشہ پیرِ رومی کے اس فرمان کو پیشِ نظر رکھے ہوئے ہے کہ

علم را بر دل زنی یارے بود   علم را بر تن زنی مارے بود

وہ ہمیں سکھاتا ہے کہ دنیا میں ترقی اور کامیابی ہمیشہ محنت اور کوشش سے حاصل ہوتی ہے، اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ رہنے سے نہ آج تک کچھ ہوا ہے اور نہ ہوگا!

اس کی نظر کتابِ مقدس کے اس زرین اصول پر ہے کہ:۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ

یعنی انسان کے لئے وہی کچھ ہے، جسے وہ اپنی محنت سے پیدا کرے، اس کی تعلیم ہر جگہ اپنی یہی جگمگاہٹ اور یہی صدائے حیات پیدا کرتی ہے کہ:۔

لا تھنوا و لا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین

نہ سست بنو اور نہ کسی طرح کا خوف کھاؤ، کیونکہ اگر تمہارے یقین و ایمان میں قوت اور مضبوطی ہے، تو تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرفراز اور کامران رہوگے۔

بس یہی ہے وہ حیات افروز پیغام، جسے اقبالؔ نے جگہ بہ جگہ بیان کیا، جس کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی اور جسے میں آیندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کروں گا۔ میں نے اس سلسلۂ بحث میں اُردو کے بعض دیگر شعرا سے بھی چیدہ چیدہ مثالیں اخذ کی ہیں۔ اس کے علاوہ نہ صرف قدیم، بلکہ فارسی زبان کے جدید شعرا کے کلام سے کچھ منتخب چیزیں زینت اوراق ہیں، پھر ٹیگور کی نظموں سے کچھ والہانہ کوائف بھی اسی ضمن میں پیش کرنا پڑے

ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مشہور جرمن فلاسفر نٹشے کے مرتعش اور ہنگامہ خیز بیانات بھی اپنے ہی قلم سے براہِ راست ترجمہ کر دیتے ہیں، لیکن ان تمام حالات میں مصنف کا مقصد جہاں علامہ اقبال کے فلسفۂ حیات کی تشریح و توضیح ہے، وہاں مضامین کے تنوع اور بیانات کی دلچسپی کو بھی ساتھ ہی ساتھ قائم اور برقرار رکھنا ہے!

اِس ضمن میں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیئے کہ میں اقبال کو آج ایک سرسری نظر کے بعد آپ حضرات کی خدمت میں پیش نہیں کر رہا، بلکہ یہ گزشتہ دس سال کے مسلسل غور و فکر اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے، جو "پیامِ اقبال" کے نام سے مزین ہو کر آپ کے سامنے آیا ہے، میرا ذاتی عقیدہ ہے۔ کہ بغیر کسی بصیرت اور مطالعہ کے جو چیز پیش کی جائے، وہ ہمیشہ ناقص اور ناکارہ ثابت ہوتی ہے اور اس سے اُس کا پیش نہ کرنا بدرجہا اچھا ہے۔

اس کے علاوہ میں دیکھتا ہوں کہ عام طور پر مصنّفین اپنی تحریر کو ضمنی مثالوں کا محکوم رکھتے ہیں، یہ میرے نزدیک ایک بہت بڑی خامی ہے، جس کی نمایاں اصلاح آج تک نہیں کی جا سکی، یہی وجہ ہے کہ میں نے اس بدعت سے بھی کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اپنی تحریر کو اشعار اور مثالوں کا محکوم ہرگز نہیں ہونے دیا ہے، زیادہ واضح الفاظ میں کیوں تحریر ہی بجائے خود ایک ایسی سیلِ رواں نہ بن جائے۔ کہ امثلہ اس کی راہ میں خس و خاشاک کی طرح بہ نکلیں، کیوں وہ ذاتی قوت اور ذاتی

اثر کے لیے کسی خارجی شے کی محتاج ہو، اور کیوں اس کی رفعتِ پرواز کسی اور مثال کا شرمندۂ احسان ہونا گوارا کرے؟ کیا اس سے فن کا عجز اور تحریر کی مفلسی ثابت نہیں ہوتی، اور کیا اس سے زیادہ بدنما دھبّہ بھی ایک اہلِ قلم کے دامن پر ہو سکتا ہے؟ پس اگر اشعار مؤلف کی تحریر سے خارج ہو کر اپنی برجستگی اور اپنی دلچسپی کھو بیٹھیں، تو یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں، لیکن تحریر کو بجائے خود ان کی وابستگی سے قطعاً بے نیاز ہونا چاہیئے!

پھر تحریر کی بھی مختلف نوعیتیں ہیں، اصولی حیثیت سے اس کو دو بڑی قسموں پر منقسم کیا جا سکتا ہے، ان دو قسموں میں سے پہلی بزمیہ اور دوسری رزمیہ ہے، یا بالفاظ دیگر پہلی قسم اپنے اندر "جمال" کے خواص رکھتی ہے، تو دوسری میں زیادہ تر "جلال" کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے ضروری ہے کہ ہر چیز کے زیرِ عنوان الفاظ اور واقعات بھی اُسی نیچر کے ہوں، پہلی قسم کا نمونہ "صحیفۂ ادب" میں دکھلایا جا چکا ہے، اب دوسری قسم اپنی پوری طاقت کے ساتھ "پیامِ اقبال" میں دکھلائی جا رہی ہے، وہ گویا ایک طور پر "شبستانِ محبت" تھا۔ جس میں مجھے بھی لازماً "حریر و پرنیاں" بن جانا پڑا، اب "مصارفِ زندگی" کا سوال درپیش ہے، تو "سیرتِ فولاد" خود بخود جلوہ پیرا ہوگی، بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ رزمیہ بیان میں بھی جو شان و شوکت اور رعب و

دبدبہ ایک اہل قلم پیدا کر سکتا ہے، وہ نہ تو کسی آرٹسٹ کے بس کا ہے، اور نہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا فلم اُس کا حق بجالا سکتا ہے، یورپ نے آج تک جو بڑے بڑے تاریخی، جنگی اور انقلابی فلم بھیجے ہیں، اُن میں بن حور، دی سائن آف کراس، کلیوپٹرا، کروسیڈس (صلاح الدین ایوبی کی حروب صلیبیہ) کاؤنٹ آف مانٹ کرسٹو تھری سکیٹرز، آئرن ماسک، رابن ہڈ، اور کیپٹن بلڈ وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایسے ڈراموں میں تقریباً ایک ہی قسم کی جنگی اور انقلابی سپرٹ کار فرما ہے. لیکن جب انسان ان تمام شرانگیز طاقتوں کو ایک جگہ جمع کر کے "شیطان" کی نسبت ایک وہم باطل کی تردید کرتا ہے. تو گویا جرأت، کامیابی، بہادری اور غلبہ و اقتدار کے تمام ممکن خواص اسی واحد مرکز پر اُتر آتے ہیں۔ وہ کہتا ہے. کہ :-

اے خدا! کیا تو دیکھتا نہیں کہ میرے سینے اور پیشانی پر ہنوز خون کے داغ دکھائی دے رہے ہیں، میرا تمام جسم لہولہان ہے، ڈھال کٹ کر دو ٹکڑے ہو چکی ہے، زرہ اکثر جگہ سے چاک چاک ہو گئی ہے. خود اچھل کر دور جا پڑا ہے، وہ مہیب اور بھاری خنجر، وہ آفت اور ہلاکت کا اژدھا، جس نے سینکڑوں کے خون پیئے ہیں، اب سستی کی وجہ سے حرکت نہیں کر سکتا، میرے دیو جیسے رثا نے مسلسل ضربات سے پھول گئے ہیں. آنکھیں شعلہ ریز ہیں اور گھوڑا ہنفک کر پسینے پسینے ہو رہا ہے. لیکن بایں ہمہ میں دلیری کے ساتھ سینہ سپر ہوں،

اور اس بہتے ہوئے خون کو عطر و گلاب کی طرح قیمتی اور فرحت ناک سمجھتا ہوں!

تو نے اس عرصۂ کارزار میں شیطان جیسی ذلیل اور کمزور ہستی کو میرا حریف بنا کر بھیجا، گو اُس نے میرے ساتھ بہت سے دھوکے اور فریب کئے۔ لیکن اُس کے یہ تمام وار میرے جسم آہنیں پر پھول ہو کر برستے رہے، بالآخر میں نے جو رُخ بدلا۔ تو ایک ہی حملہ میں اس کا کام تمام کر دیا، وہ دیکھ! اس کا نفرت انگیز اور مکروہ لاشہ زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ اپنے کارکنوں سے کہہ اس کو میرے سامنے سے اُٹھا کر لے جائیں۔ ایسی کمزور اور خفیف شے کی نسبت تو نے ایک چڑیا ہی کو میرے شکار کے لئے کیوں نہ بھیج دیا؟

"آہ! آگ اور خون کا یہ بھڑکتا ہوا بے پایاں سمندر، اور اس کی تواضع کے لئے گھاس کے یہ دو چار تنکے!! ہائے افسوس، یہ کسی جادوگر کا جھوٹا طلسم تو نہ تھا جس کی اس قدر توہین کی گئی"۔

"بے شک میں فرعون کا حامی نہیں، بے شک میں ہلاکو اور چنگیز جیسے ظالم اور جابر لوگوں کی تائید نہیں کر سکتا، لیکن اگر ضرورت پیش آئے۔ تو اے خدا! خالدؓ اور حیدرؓ کا خون آج بھی میری رگوں میں موجزن ہے اور صلاح الدین ایوبیؒ کی روح آج بھی میرے جسم میں تڑپ رہی ہے"۔

یہ انداز، واقعات کی یہ تصویر کشی، محاکات کا یہ معنوی انبعاث، اور طبیعت کا یہ سچا اخلاص یقیناً ایک زبردست انقلابی روح کی ترجمانی کر رہا ہے، جسے شاید مذکورہ قسم کے بیسیوں ڈرامے بھی بروئے کار نہیں لا سکتے۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر بنی آدم خدا کے سامنے اپنی ناقابل تسخیر قوت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "اے خدا! یہ دنیا کس قدر خوبصورت اور نظر فریب ہے، غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی خشم آلود اور قہرمان سرخیوں سے بھی زیادہ، ستاروں کے روشن اور جگمگاتے ہوئے کارواں سے بھی زیادہ، ہمیشہ گردش اور سیر و سفر میں رہنے والے چاند سے بھی زیادہ، کوہکن کے خارا شکاف تیشے اور جوئے شیر کی دل کش دھار سے بھی زیادہ، توپوں کی مار اور ہتھیاروں کی جھنکار سے بھی زیادہ، میدانِ جنگ میں گھوڑوں کی ٹاپ اور سپاہیوں کی خوفناک چیخ و پکار سے بھی زیادہ حق اور باطل کی معرکہ آرائی میں خون کی بہتی ہوئی لالہ رنگ ندیوں سے بھی زیادہ، الغرض تیری خاموش اور پُر سکون دنیا سے بھی زیادہ، لیکن تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس تماشا گاہ کی رونق اور آبادی کس کے دم سے ہے؟ ہاں وہ فقط میں ہوں، اور میری بے پناہ قوت ہے جس نے ان تمام فرائض کی بجا آوری کی اور تیری عزت کو فنا ہونے سے بچایا! اے انقلابِ زماں کے مبصر! تاریخ میں اپنی پیش کی ہوئی اس

کارگزاری کا غور سے مطالعہ کرے"!

اس بیان میں نبرد آزمائی کا جس طور پر ذکر آیا ہے، یا میدانِ جنگ کا جیسا صحیح اور مکمل نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ خود کسی سپاہی نے بھی اس شدت اور ہیبت کے ساتھ کبھی محسوس نہیں کیا ہوگا، پھر آخر یہ بات کیا ہے؟ یہی کہ الفاظ کو ہمیشہ عنوان کی مناسبت اور مضامین کی نیچر کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے، یہی بلاغت ہے، اسی سے اُردو زبان کی شان قائم ہوگی یہی تحریر و تصنیف کا اصل ضابطہ ہے، جس کے لئے میں نے مثالوں سے بھی اس مطلب کو واضح کر دینا نہایت ضروری سمجھا۔

اس کے علاوہ یہ بھی نہیں کہ میں ان ہنگامہ آفریں تاثرات میں آپ کو فردوسی کی طرح رستم و سہراب کا اکھاڑہ دکھا کر خوش کروں گا کیونکہ یہ موہوم سے قصے ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں ہوگا کہ میں میر انیس، میر مونس اور میرزا دبیر، یا دیگر مرثیہ گو شعرا کی طرح آپ کو شغلِ سینہ کادی اور نوحہ خوانی میں مصروف دیکھوں، کیونکہ اس سے میرا مقصد رونا رُلانا نہیں، اور نہ ہی اتنا ظاہر کر دینے میں کوئی اخلاقی بلندی پائی جاتی ہے، آج شہدائے کربلا کی یادگاریں کتنے ایسے لوگ ہیں جو ماتمی لباس زیبِ تن کر لینے کے علاوہ عملاً بھی ان کے پیرو ہوں۔؟

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ میں "فردوسیٔ ہند" کی طرح ایک مشست

اور غیر متحرک پیرایہ میں اسلام کی عظمت کا "افسانہ" سنانے بیٹھوں[1] بلکہ میں تو آپ کو ایک "موجود" اور "مشہود" انسان کی عظمت اور

---

[1] ایران کے فردوسی نے بلاشبہ اپنے شاہنامہ میں رزمیہ خصوصیات کو کہیں بھی فوت نہیں ہونے دیا ہے، مثلاً تسلسل، بیان کی روانی، اسلحہ کی شان و شوکت، نظر کی ہیبت، جسمانی دبدبہ، سوال و جواب کی دھمک، غیظ و غضب کی روح، الفاظ کی گرمی، بندش کی چستی اور واقعہ نگاری رزمیہ شاعری کی اہم ترین خصوصیات ہیں، جن کا حق فردوسی نے ادا کر دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مکرم بھائی "فردوسی ہند" کی زبان اور لب و لہجہ ان ضروریات سے بہت پیچھے ہے۔ مقصد بہت اچھا ہے۔ لیکن طبائع کا قدرتی میلان ایک فطری اور نفسیاتی امر ہے اور اس کی باگ ڈور سراسر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہیں آکر یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ سعدی کا تغزل اور معاملہ بندی کیوں لاجواب ہے۔ وہ رزمیہ اشعار کہنے سے کیوں عاجز رہا اور فردوسی نے بجائے خود غزل کیوں نہ لکھی۔ میر قصیدہ کیوں نہ کہہ سکے اور سودا کی غزلیات میں وہ سوز و اثر کیوں نہیں پایا جاتا جو میر کے ہاں موجود ہے؟ تاہم انصاف کی رو سے ہندوستان میں اگر کوئی شخص رزمیہ شاعری کے لوازمات ادا کر سکا ہے، تو وہ فقط میر انیس ہیں۔ ان کے حریف میرزا دبیر کو بھی یہ بات نصیب نہیں!

ایک شخص نے مجھ سے کہا، کہ صاحب حفیظ کو "خانصاحب" کا خطاب ملا ہے۔ میں نے اس احمق کو جواب دیا کہ "شاعری اور ادب" کو خانصاحب کے خطاب سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

کبریائی کی جانب متوجہ کرتا ہوں، میرے نزدیک اس وقت محض قبروں اور مزاروں پر معتکف ہو جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، ان کی تعریف میں سریلی آواز سے اشعار پڑھ کر دینا بھی کچھ سودمند نہیں، بلکہ اس دور میں جب کہ افراد اور قوموں کے استقلالِ ذاتی کا سوال درپیش ہے اور جب کہ زمانہ کمزور اور ضعیف العقیدہ لوگوں سے زندگی کا حق چھین لینا چاہتا ہے، میں آپ کو خوددار، غیرت مند، اور محکم انسان کی بشارت سناتا ہوں اور وہ محکم انسان کوئی اور نہیں، بلکہ ہم اور آپ ہی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ زندگی کی شاہراہ میں جو کچھ ہم سے لُٹ گیا ہم سر نیوڑھائے اسی کی فکر میں مستغرق رہیں، بلکہ میرے نزدیک وہ کھوئی ہوئی چیزیں

(بقیہ گذشتہ صفحہ) کوئی معنوی ربط ہی نہیں اور ایسے خطابات فقط "وفاداری" اور "اطاعت" جیسی صفاتِ عالیہ کی خاطر دیئے جاسکتے ہیں۔ اور اگر یہ خطاب ادبی لحاظ سے بھی ہوں تو ان سے کسی شاعر کی زندگی اور بقا کو کون سا مستقل فائدہ پہنچ سکتا ہے کوئی زمانہ تھا بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو "خاقانی ہند" کا خطاب دے کر اس کی شاعرانہ عظمت بڑھانا چاہی، لیکن آج ذوق مردہ ہے اور اس کے مدمقابل مرزا غالب کی ہر طرف پرستش ہوتی ہے، اس لئے حکومتِ وقت کے خطاب کو حقیقت اور قابلیت کے ساتھ دور کا لگاؤ بھی نہیں ؎

برد ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

بہت ہی معمولی اور حقیر سی چیزیں تھیں، ہمیں اب اُس گنجینے پر نظر ڈالنی چاہیئے جو ہمارے اپنے سینوں میں مدفون ہے اور جو استعمال کرنے سے کبھی ختم نہ ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ ذکرِ ماضی جانے دو، سنگریزوں کی جانب لپکنا کچھ معنی نہیں رکھتا، اپنے حال اور استقبال کو زیادہ سے زیادہ شاندار بناؤ۔ جواہرات اسی سے حاصل ہوں گے ؎

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں؟
یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر!
زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

(اقبالؔ)

دنیا کی رفتار ابتدائے آفرینش سے بتدریج آگے بڑھ رہی ہے اور تم نادانوں کی طرح پیچھے دیکھتے ہو، زمانہ تمہیں عروج بخشتا ہے اور تم پستی کی طرف مائل ہوتے ہو۔ عقل چاہتی ہے کہ جہاں خالق کا

ہاتھ اپنی پوری فیاضی دکھلا رہا ہے، اور کائنات کے ہر جز نے اپنا پہلا لباس اُتار کر ترقی اور کمال کی جانب قدم بڑھایا ہے، وہاں انسان بھی اپنا قدرتی حق فوت نہ ہونے دے، لیکن اے بدقسمت انسان تیری حالت تو یہ ہے کہ تو اشرف المخلوقات کا برگزیدہ لقب رکھتے ہوئے بھی کولہو کے بیل کی طرح گز بھر زمین پر قانع ہے اور اس دوڑ میں سب سے پیچھے رہ جانا چاہتا ہے، قدرت نے تجھے پرواز کے لئے پر عنایت کئے ہیں، لیکن تو انہیں استعمال میں نہ لانے سے عنقریب اپاہج ہو کر بیٹھ جائے گا۔ بتا تو سہی وہ کون سی تلوار ہے جو استعمال کئے بغیر بھی چمکیلی اور تیز رہ سکی ہو، اور وہ کون سا ایسا چشمہ ہے، جس نے رواں دواں رہے بغیر اپنا رنگ اور مزا بدل نہ دیا ہو!

میں نے ایک دوسری جگہ صاف طور پر عرض کر دیا ہے کہ فطرت کی پیروی کرنے والا انسان ہی مکمل انسان ہے، یقیناً اُس کے پاس خدائی طاقتیں اور خدائی اختیارات ہیں، کائنات کی تجدید اور اصلاح بھی فقط وہی کر سکتا ہے، اور قیامت کا واقع ہونا بھی اس کی جنبشِ مژگاں کے علاوہ حقیقتاً کوئی دوسری وجہ نہیں رکھتا۔

"مگر ہاں، ابھی کل ہی کی بات ہے۔ کہ آدم کی روح میرے سینہ میں چلائی، اُس کا لہجہ شکایت آمیز تھا، اُس نے کہا۔" یہ دنیا اب کس قدر پرانی اور یہ ایوان کس قدر بوسیدہ ہو چکا ہے۔ اُس کی دیواریں بالکل گرنے کو ہیں۔ آسمان کی نیلی چھت میں ٹنگے ہوئے یہ روشن فانوس اب

اپنی روشنی کھو چکے ہیں، اور دیگر اشیا بھی میرے لئے چنداں کشش نہیں رکھتیں۔ ہواؤں کی اداس موسیقی، اور کائنات کا مبہم انتشار آدم کے سکون پر طعنہ زن ہے، اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مردِ خدا پھر سے اس کی تعمیر کرے گا، اور اُس کی جنبش یہ گمشدہ رونق پھر سے یہاں لائے گی۔ ستارے اس خوشی میں اک بے پناہ رقص کریں گے اور اُن کے رقص سے دنیا کا گوشہ گوشہ جگمگا اُٹھے گا"۔۔۔۔۔۔

میں نے کہا "کہ کچھ ہرج نہیں، اگر دوسری تمام چیزیں مدھم پڑ چکی ہیں، تو فطرت کی روشنی اب تک باقی ہے، یہی ان تمام ضروریات کو مہیا کرے گی"۔

پس تو معلوم ہوا کہ جہاں میں اسلاف کی عظمت اور بزرگی کا قائل ہوں، وہاں میرے نزدیک موجودہ انسان ہی ترقی اور معراج کا انتہائی کمال ہے، یہی ہر طرح سے قابلِ اعتماد اور قابلِ فخر ہستی ہے، اسی کی ذات سے انسانیت کی تمام مشکلیں حل ہوں گی، اور اگر کوئی چیز ماضی کی داستانوں کو مفید اور بامعنی بنا سکتی ہے، تو وہ بھی اسی کی سرگرمی اور ناقابلِ تسخیر قوت ہے!

طارق

ڈاکٹر سر محمدؐ اقبال

آپ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے، بوقتِ وفات آپ کی عمر تقریباً ۶۲ سال کی تھی۔ ابتداً کچھ دنوں مکتب میں بھی تعلیم پائی، اور پھر مدرسے میں داخل ہوتے اور پانچویں جماعت کا امتحان وظیفہ لے کر پاس کیا۔ اسی طرح مڈل میں بھی نہایت کامیابی کے ساتھ وظیفہ حاصل کیا، اور جب انٹرنس کے امتحان میں بیٹھے، تو یہاں بھی پرائمری اور مڈل کی طرح سرکاری وظیفہ لے کر کامیاب ہوئے۔

اس کے بعد جب آپ ایف۔ اے (سکاچ مشن کالج سیالکوٹ) میں داخل ہوئے تو مولانا سید میر حسن جیسے قابل سخن شناس، عالم متبحر اور استادِ شفیق کی توجہ خاص اور فیضانِ صحبت و تربیت نے اُن جوہروں کو جو قدرت نے آپ کو ودیعت کئے تھے۔ جِلاد ینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

سیالکوٹ کالج سے فارغ ہو کر آپ لاہور گورنمنٹ کالج

کی بی۔ اے کلاس میں داخل ہوئے۔ طبیعت چونکہ فلسفیانہ پائی تھی اس لئے بی۔ اے کے امتحان میں فلسفہ کا مضمون لے کر نہ صرف پاس ہی ہوئے، بلکہ انگریزی اور عربی میں نمایاں طور پر کامیاب رہنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔ انہیں دنوں مسٹر ڈبلیو آرنلڈ صاحب علی گڑھ کالج سے گورنمنٹ کالج چلے آئے تھے فلسفہ دانی میں آرنلڈ صاحب کی شہرت عالمگیر ہے۔ چنانچہ طبعی مناسبت ہونے کی وجہ سے اقبال اور آرنلڈ میں رفتہ رفتہ دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے اور علامہ موصوف نے کافی طور پر ان سے کسبِ فضیلت کیا!

بعد ازاں ایم۔ اے کا امتحان پاس کر چکنے کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ اور سیاست مدن کے مضامین پر آپ لیکچرار دینے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ افسرانِ اعلیٰ اور عہدہ دارانِ تعلیم کی رائے ان کی خدمات اور لیاقتِ علمی کے متعلق بہت اچھی تھی، اسی زمانہ میں سیاست مدن پر ایک کتاب اُردو زبان میں بنام "علم الاقتصاد" لکھی۔

اس کے بعد آپ ولایت تشریف لے گئے، کامل تین سال تک وہاں قیام کیا، اور کیمبرج یونیورسٹی سے علمی تحقیقات کے عوض فلسفۂ اخلاق کی ڈگری بھی حاصل کی، پھر جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے

ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی فرسٹ کلاس ڈگری ایک کتاب فلسفۂ ایران لکھنے سے حاصل کی۔ فضلائے یورپ نے اس کتاب کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے!

جرمنی سے واپس آنے کے بعد لندن کے سکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخل ہوئے، اور وہاں کے پروفیسروں، عالموں، بڑے بڑے سائنسدانوں اور انگلستان کے دیگر فضلاء، حکما، علما اور مدبرین سے استفادہ کیا۔ اور بیرسٹری کا امتحان بھی کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔

اسی دوران میں آپ نے وہاں اسلام کی حقیقت پر چھ پبلک لیکچر دیئے جو بہت مقبول ہوئے۔ چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے آپ عربی پروفیسر بھی رہے۔

بالآخر آپ ولایت سے وطن کو واپس روانہ ہوئے اور بمبئی دہلی، انبالہ ٹھیرتے اور اپنے دوستوں سے ملتے ہوئے ۲۷ جولائی سنہ ۱۹۰۸ء بروز سوموار شام کی گاڑی سے لاہور تشریف لائے، جہاں اُن کے احباب اور دیگر بزرگان لاہور بلا تخصیص مذہب و ملت اُن کے خیر مقدم کے لئے سٹیشن پر موجود تھے۔ شام کو اُن کے اعزاز میں ایک پارٹی منعقد ہوئی۔ جہاں اکثر احباب نے نظمیں پڑھیں، ایک دن کے قیام کے بعد آپ سیالکوٹ تشریف لے گئے!

علامہ اقبالؔ کی شاعری ملت کی جان ہے، عین اس وقت میں جبکہ مشرق اپنی گذشتہ شوکت کو کھو بیٹھا تھا اور مسلمان اپنے فرائض زندگی سے غافل ہو کر خود فراموشی کی گہری نیند سو رہے تھے، قدرت نے ایک ایسا انسان پیدا کیا، جو سراپا عشق تھا اور جس کے درد بھرے دل نے اپنی صدائے حقیقت نواز کا اثر دکھلا کر سر زمین ہند کو محبت اور وحدت کے پر سوز نغموں سے معمور کر دیا، دنیا جو مادہ پرستی کی وجہ سے اپنا روحانی ذوق بالکل کھو بیٹھی تھی، قدرتی طور پر یہ ضرورت محسوس کر رہی تھی، کہ کوئی مردِ خدا آئے جو اس کی موت کو زندگی سے بدل دے، پس ایسی حالت میں فطرت نے پھر سے اپنی کمی کو پورا کرنے کے لئے اقبالؔ جیسی ہستی کو سامنے لا کھڑا کیا جس نے ہمارے شکوک و شبہات اور مایوسی و حسرت کو امید اور یقین کے نور سے یکسر زائل کر دیا۔

پس اس تاریک ماحول کے اندر ایسی صفات کا پیدا ہو جانا کوئی معمولی چیز نہیں، حقیقت یہ ہے کہ قدرت کو جس شخص سے ایسی بلند اور اعلیٰ خدمات لینا منظور ہوتی ہیں، اُسے دل اور دماغ بھی ایسا ہی قوی اور روشن عنایت کیا جاتا ہے۔ جو زمانے کے انقلاب اور باطل کی فریب کاریوں سے کسی حالت میں بھی مغلوب اور متاثر نہیں ہو سکتا۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں فطرت اور صرف فطرت ہی کو اپنے عمل کا صحیح اور سچا معیار خیال کرتا ہے۔ کائنات کا ہر ذرّہ حقیقت کی

طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ جب ستارے کو کہیں دیکھ پاتا ہے، تو اس میں بھی اُسے شاہدِ حقیقی کی جھلک نظر آتی ہے، چاند کا حسین اور دلربا چہرہ بھی اُسے مسحور نہیں کر سکتا، بلکہ اسے بھی وہ کسی کے پرتوِ حسن کا ایک ادھورا سا نقش تصور کرتا ہے۔ آفتاب بھی اپنی ان تمام تجمل آرائیوں کے باوجود اُسے اپنی طرف مائل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ بھی اس کے نزدیک کسی قادرِ مطلق کی کبریائی اور عظمت کا شاہد ہے۔

لیکن کیا یہ مرتبہ کوئی معمولی سا مرتبہ ہے اور کیا اس کا حاصل کرنا کوئی آسان سی چیز ہے؟ سو اس کا جواب فقط یہی ہو سکتا ہے کہ:-

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

اور اس لئے یاد رہے کہ قدرت ایسی برگزیدہ خصوصیات کو بار بار منصۂ شہود پر نہیں لایا کرتی بلکہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

چنانچہ علامہ اقبال بھی ایک ایسے ہی دیدہ ور ہیں۔ وہ خود بیدار ہیں اور دوسروں کو بیدار کرنا چاہتے ہیں، وہ طریقِ عمل میں خود مردانہ وار گامزن ہیں، اور دوسروں کو بھی اسی راستے پر چلانا چاہتے ہیں، انہوں نے عشق اور عشق کے ساتھ زندگی کے صحیح احساس کو پالیا ہے، اور چاہتے ہیں کہ ان کی قوم بھی اس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز ہو، اُن کا سینہ

سوزِ محبت سے اس لئے مالا مال ہے کہ قوم اُسے اپنے لئے عام کرے، تاکہ وہ اپنی کھوئی شان کو دوبارہ حاصل کر سکے، وہ اسلاف کی عظمت کو بار بار اس لئے یاد دلاتے ہیں، کہ مسلمان پھر سے اُن کی پیروی کر کے غلامی کی ذلت سے نجات حاصل کر سکیں، وہ اپنے بھٹکے ہوتے قافلے کو ایک دفعہ پھر حجاز کا راستہ دکھانے میں ساعی ہیں۔ ان کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ مسلمان اپنی بدعملیوں اور نفسانی اغراض سے دین و ملت کو بدنام کریں، اُن کا دل مسلمانوں کی موجودہ بے حسی اور جمود کو دیکھ کر کڑھتا ہے۔ اس لئے وہ احساسِ خودی ضبطِ نفس کے پاکیزہ جذبات کو ایک دفعہ پھر ان کے اندر تر و تازہ کر دینا چاہتے ہیں۔

کیا یورپ کے بڑھتے ہوتے سیلاب میں یہ ایک غیر معمولی چیز نہیں ہے؟ کیا مادہ پرستی اور ہوا و ہوس کی تردید ان سے زیادہ پُر زور الفاظ میں بھی کوئی کر سکتا ہے، یہاں بے اختیار گرامی مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ ؎

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبالؔ
پیغمبری کرد و پیمبر نہ تواں گفت

علامہ اقبال کا بیان نہایت پُر زور ہوتا ہے، الفاظ پُر شوکت

اور بندشیں چُست ہیں۔ فارسی میں اِس وقت تک آپ کی پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں، مثنوی اسرارِ ورموز[1]، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ اور مثنوی " پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" لیکن ان میں سب سے زیادہ جامع اور لطیف چیز مثنوی اسرار و رموز ہے، ان دو مثنویوں کے اندر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا فلسفہ نہایت خوبی اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اِس کے علاوہ زبان نہایت شیریں اور تسلسل قابلِ داد ہے، اس کے بعد پیامِ مشرق کی زبان اس سے بھی زیادہ صاف اور سریع الفہم ہے اور اس کے اشعار میں ایک بالکل جداگانہ موسیقی سی پائی جاتی ہے جس سے وجدان راحت حاصل کرتا ہے۔ اس کتاب میں بھی زیادہ تر عشق و عمل کی ضرورت، اور موجودہ تہذیب کے نقائص کو بہت اچھی طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

پھر جاوید نامہ کی نوعیت اور انداز تمام دوسری چیزوں سے مختلف ہے، گو اس میں بھی دین و سیاست کے اہم ترین حقائق کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن انداز (Plan) کی حیثیت سے یہ چیز معراج نامہ، یا دانتے[2] کی ڈوائن کمیڈی سے ملتی جلتی ہے، جس

---

[1] یہ کتاب علامہ مرحوم کی زندگی ہی میں تکمیل پا چکی تھی۔

[2] شعرا کے حق میں یہ عجیب بات ہے۔ کہ اُن کے بڑے بڑے کارنامے اکثر حالتوں میں کسی نہ کسی محبوب کے شرمندہ احسان ہوا کرتے ہیں، اور اس کے بغیر

(باقی اگلے صفحہ پر)

طرح ڈینٹے ہفت افلاک کی سیر کرتے ہوئے جنّت اور دوزخ کو دیکھتا، اور ارواح خبیثہ و ارواح طیّبہ سے ملاقات کرتا ہے۔

(بقیہ گذشتہ صلا) اُن کے کلام میں کوئی خاص سوز یا محرک جذبہ نہیں پایا گیا، ہمارے خیال میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے، آخر جب یہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ سمندر کا جوش کھانا اصل میں ماہتاب کی کرنوں سے ہے، تو کیوں دل بھی، جو عشق کے سوز میں ڈوبا ہوا ایک محشر ستان ہے۔ پر توِ حُسن کے بغیر خاموش نہ رہے، چنانچہ یہی کیفیت اٹلی کے مشہور شاعر ڈینٹے کی ہے، اس کا کلام روحانیت اور سوز و اثر سے لبریز ہے اور صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ بچپن ہی سے ایک حسین لڑکی کے دامِ الفت میں گرفتار ہو چکا تھا، یہ ایک رئیس کی لڑکی تھی اور اس کا نام بیٹرس تھا۔ ڈینٹے نے اس کو پہلے پہل دس برس کی عمر میں دیکھا، بس دیکھنا تھا کہ نگاہ جگر کے پار ہو گئی ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

پھر مسلسل دس برس تک اُسے دیدار کا موقع نہ مل سکا، دوسرے بچے کھیلتے، خوشیاں مناتے، لیکن وہ ہمیشہ ایک طرف اداس کھڑا رہتا۔ اس کی توجہ کا مرکز اس کی محبوبہ تھی، ابتدائے عمر میں اس کی یہ کیفیت سراسر اس شعر کی مصداق ثابت ہو رہی ہے کہ ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

(باقی آگے صلا پر)

اسی طرح اقبال بھی اپنی پرواز میں مشرق اور مغرب کی بعض ممتاز اور تاریخی شخصیتوں سے ہم کلام ہوتا ہے اور اس طرح سے ان

(بقیہ گذشتہ صفحہ ۴۵) پھر بیس برس کی عمر میں وہ دوبارہ اس سے ملا۔ اور ایک دیوی کی طرح اس کی پرستش کرتا رہا۔ بیٹرس بھی ڈینٹے کی سچی فدائیت کو دل سے سراہتی تھی، ڈینٹے اُسے ایک "آسمانی مخلوق" سمجھتا۔ اور وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ وہ اس محبوبہ کے رعبِ حسن کی تاب نہ لاکر اس کے سامنے بہت کم جاتا، لیکن دوسری عورتوں میں اُس کے لاثانی حسن اور بے ریا پاکیزگی کی تعریف ضرور کیا کرتا۔ بیٹرس نے یہ دیکھ کر یکایک بدگمانی کی اور اس کو عہد شکنی پر محمول کرتے ہوئے، اُس سے اپنا منہ موڑ لیا، وہ تو مغرور تھی کیونکہ عورت میں رشک اور رقابت کا جذبہ قدرتی طور پر تیز ہوتا ہے۔ مگر ڈینٹے کا دل اس حادثہ سے پاش پاش ہوگیا اور کچھ عرصہ کے لئے اس نے خود کو اٹلی کی سیاسی جنگ میں مصروف رکھ کر ناشاد طبیعت کو بہلانا چاہا، لیکن جب وہ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ بیٹرس چند ہی روز بعد اپنی عمر کے چوبیسویں سال میں دنیائے فانی سے رخصت ہوئی، آہ! جس نے ڈینٹے پر بے وفائی کا الزام لگایا تھا۔ عمرِ عزیز خود اس سے بے وفائی کر گئی۔ موت کی ستم ظریفی دیکھو۔ کہ وہ بوسیدہ اور خشک ٹہنیوں کو چھانٹتے چھانٹتے کلیوں اور تر و تازہ پھولوں کو بھی کس بے باکی سے توڑ لیتی ہے، ناظرین اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اس بے غریب ڈینٹے پر کیا کچھ نہ گذر گئی ہوگی۔ چنانچہ وہ اس موت پر جس کا خدشہ ایک عاشقِ صادق ہونے کی حیثیت میں اس کو عرصہ دراز سے ستا رہا تھا۔ (باقی اگلے صفحہ ۴۷ پر)

بیانات کو اسلامیت کا رنگ دے کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ الغرض دوسری کتابوں میں بھی ایسے اسباب اور ضروریات

(بقیہ گذشتہ صث ۴۶) ایک دردناک نوحہ کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس نوحے کی ترجمانی غالب کے مندرجہ ذیل نوحے سے بہتر نہیں کی جا سکتی۔ جس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کی طرح دل میں پیوست ہوا جاتا ہے ؎

درد سے میرے ہے تجھکو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں میری غم خوارگی کا آیا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اُسے ناسازگاری ہائے ہائے
گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

پر بحث کی گئی ہے، کہ جن کی بنا پر زیادہ تر اسرار و رموز کے نظریات پر ہے، بحیثیت مجموعی کلام میں سوز اور اثر بہت زیادہ ہے۔

(بقیہ گذشتہ صفحہ ۴۷)

خاک میں ناموس پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

یہ گویا ڈینیٹے ہی کا سانحہ تھا۔ جو غالبؔ کی زبان سے حرف بحرف ادا ہوا ہے۔ بعد ازاں اس حق گو اور صداقت پسند شاعر کی جلاوطنی عمل میں آئی۔ وہ زندگی کے آخری سانس تک اپنی معصوم اور پری جمال محبوبہ کو فراموش نہ کر سکا اس کی ہر نظم اور ہر کتاب میں اس لڑکی کی جانب کسی نہ کسی طرح سے اشارہ ضرور پایا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "ڈوائن کمیڈی" جیسی چیز بھی اسی کی یاد میں ایک

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

جس موضوع کو بھی لیتے ہیں، اُس کے ہر ممکن احساس کو نمایاں کر کے چھوڑتے ہیں اور بیان کی کوئی شق بھی رہنے نہیں پاتی!

اسی طرح اُردو اشعار میں بھی نادر تشبیہات، بلند استعارات اور فارسی کی جدت ترکیبوں سے ایک ایسی جدت پیدا کر دیتے ہیں. جو مرزا غالبؔ کے سوا اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتی، یہی حال تخیل کا ہے. اس لحاظ سے مولانا حامد حسین قادری نے میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی شاعرانہ مماثلت کا ذکر کرتے ہوئے کچھ بے جا نہیں کہا تھا کہ ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے
جن کی فیضِ طبع نے اُردو کو گنجِ زر دیا

(بقیہ گذشتہ صفحہ ۴۸) ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ ہے. شاعر کی روح اور تخیل کو اس ناکام الفت نے پرواز بخشی، وہ اس درد میں بئٹرس کی اتنی توقیر کرتا ہے. کہ جنت کی سیر کرتے ہوئے بھی اکثر مناظر میں اُسی کو اپنا رہنما قرار دیا ہے اور ثواب و عذاب کے بہت سے پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی بھی اسی کی طرف سے ہوئی، ڈینٹے سے بڑھ کر اپنے محبوب کی یادگار دنیا میں اور کون قائم کرے گا؟

کہتے ہیں کہ خود شاعر نے اس کا نام صرف کمیڈی رکھا تھا، اس پر "ڈوائن" کا اضافہ اٹلی کے باشندوں نے کیا. کیونکہ یہ چیز اپنے تقدس اور روحانی کیف کی بنا پر اسی خطاب کی مستحق سمجھی گئی، بہر کیف یہ ہے ڈینٹے کا مجمل حال اور یہ ہے "ڈوائن کمیڈی" کی نسبت شانِ نزول کا ایک مختصر سا خاکہ!

طارق

ایک اثر میں بڑھ گیا اک رفعتِ تخیّل میں
تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری میں بس یہی دونوں کمال
تیسرے میں اس لئے دونوں کو یک جا کر دیا

اس راہ میں بڑی مشکل یہ ہے کہ دنیا ایسے بلند پایہ، اور زود رس شاعر کا کلام سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہی ہے، حالانکہ یہی تعلیم ایک ایسی تعلیم ہے، جس سے روح کو فروغ اور دماغ کو بیداری حاصل ہوتی ہے۔ بظاہر اس کا بڑا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا میلان زیادہ تر مادہ پرستی کی طرف ہوگیا ہے اور لوگ ہر چیز کو سطحی نظر سے دیکھنے لگے ہیں، مرزا غالب کو اپنے وقت میں شکایت تھی تو حضرت علّامہ اپنے ہمعصر لوگوں کی بے حسی اور ناقابلیت پر نالاں ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست | یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست
ناامید استم ز یارانِ قدیم | طُورِ من سوزد کہ می آید کلیم

پس ضرورت ہے کہ نوجوان طبقہ خاص طور پر اپنے فرائض کو محسوس کرتے ہوئے کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑا ہو۔ اپنے قومی شاعر کے پیغام کو خود سمجھے، عمل کرے اور پھر دوسروں کو بھی اس کی طرف دعوت دے!

ذیل میں ہم علّامہ موصوف کے کلام پر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔ ہر مضمون کے لئے ایک مناسب عنوان تجویز کر دیا گیا ہے۔

تاکہ بیان کا ربط اور تسلسل بھی قائم رہے اور ناظرین کے لئے بھی آسانی ہو۔

شانِ توحید

توحید کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیالات کا بکثرت اظہار فرمایا ہے مختلف مقامات پر اس کی اہمیت اور ضرورت پر بحث کی ہے اور شرک کے لئے کوئی معمولی گنجائش بھی باقی نہیں رہنے دی، چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔ "اسرارِ خودی" میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیشِ باطل گردنش

خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

ایسا شخص توحید جیسی جلیل الشان نعمت کی خاطر ابراہیم کی طرح اپنے لختِ جگر کو بھی قربان کر دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ؎

می کند از ماسوا قطع نظر   می نہد ساطور[1] بر حلقِ پسر

---

[1] چھری

یا بحکمِ مثلِ ہجومِ لشکر است[1] جان بحشیم او ز بادارزاں ترست

پھر "پیامِ مشرق" میں ایک جگہ مسلمانوں کی اعتقادی کمزوری اور ضعفِ ایمان کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں ؎

رمیدی از خداوندانِ افرنگ دلے بر گور و گنبد سجدہ پاشی
بہ لالائی[2] چناں عادت گرفتی زسنگِ راہ مولاے تراشی

پھر اس سے زیادہ افسوسناک سانحہ مسلمانوں کی موجودہ مذہبی تفریق ہے، ہر شخص اپنے لئے ایک جداگانہ مذہب کا خواستگار ہے اور پھر اپنے غلط یا صحیح عقیدے کی خاطر دوسروں کو گالیاں تک دینے سے دریغ نہیں کرتا، لیکن دوربین نگاہیں خوب اچھی طرح سے جانتی ہیں، کہ ان تمام اختلافات کا مقصد حق اور صداقت کی حمایت ہرگز نہیں، بلکہ نفسانی اغراض اور ہوا و ہوس کی پیروی ہے۔ مذہب اور مذہب کے ساتھ توحید الٰہی کا خون کیا جا رہا ہے، توحیدِ وحدتِ قومی اور اتحادِ ملی کے لئے ایک مرکز کے قائم مقام ہے، لیکن ظاہر ہے کہ آپس کے بے بنیاد جھگڑوں اور فرقہ بندیوں سے یہ مرکز کسی حالت میں بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ سو اس معاملہ میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہوا و ہوس کے ان بتوں کو گرا دیا جائے، پاش پاش کر دیا جائے، بس اسی کی تاکید کرتے ہوئے

---

[1] تلمیح بآیۂ شریفہ ان ابراھیم کان امۃً قانتاً للہ الخ

[2] غلامی۔ ذلت یا انفعال

علامہ اقبال ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

اے کہ نہ شناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

خفی اور جلی، شرک کی دو قسمیں ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ اختلاف شرک جلی سے کم نہیں کہ حقِ خلافت ثابت کرنے کے لئے ابوبکرؓ اور علیؓ جیسی برگزیدہ اور مخلص ہستیوں کو سامنے لاکر ایک دوسرے کی تذلیل کی جائے، آج سے تیرہ سو سال پیشتر اسی افسوس ناک واقعہ نے اسلامی تاریخ کے زرّین ورق پر ایک بدنما دھبّے کا کام کیا۔ لیکن یہ کیا مصیبت ہے۔ کہ آج بھی اس اختلاف کو مٹانے کی کوشش نہیں کی جاتی، اس سے اسلامی وحدت برباد ہو رہی ہے، اور ہمسایہ قوموں کے لئے ہنسی تمسخر کا سامان پیدا ہوتا ہے، آخر گڑے مردوں کی ہڈیاں اکھیڑنا اور ایک دوسرے کو خفیف کرنا کون سی عقلمندی ہے اور اس سے فی الحال کس جماعت کو کون سے خاص فائدے کی توقع ہے؟ بس ؎

ہر کہ با زندہ از پئے مردہ
می کند جنگ سخت نادان است

نفسیاتِ خودی

خودی انسان کا ذاتی کمالات اور فطری تاثرات سے باخبر ہو کر

عملی طور پر ان کی حفاظت کرنے کا نام ہے۔ انسان زندگی کی شاہراہ میں جوں جوں قدم آگے بڑھاتا ہے، توں توں وہ اپنی باطنی قوتوں سے بے خبر ہوتا چلا جاتا ہے، شکوک اور شبہات کی تاریکیاں اُسے گھیر لیتی ہیں، وہ دوسروں کی طرف دیکھتا ہے، لیکن خود کو فراموش کر دیتا ہے اُسے یہ سرمدی پیغام یاد نہیں رہتا۔ کہ ؎

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا می روی؟

اور یہ سب کچھ اُس کے اپنے اعتقاد کی کمزوری کی وجہ سے ظہور میں آتا ہے ورنہ اگر وہ ذاتی کمالات کی طرف نظر کرے، اور اپنی قدر آپ کرنے لگے، تو کون سی چیز ہے جسے وہ مسخر نہیں کر سکتا۔

خدا نے تو ازل ہی سے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے، اور اس کی فطرت سراپا خیر ہے، پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعد ازاں اس خیر میں شر کی آمیزش کیوں ہو جاتی ہے، انسان اپنی صفاتِ عالیہ کو روز بروز فراموش کیوں کرتا چلا جاتا ہے اور یہ صاف و شفّاف چشمہ امتدادِ زمان سے گدلا کیوں ہونے لگتا ہے؟ اس کا جواب ورڈس ورتھ نے نہایت موثر اور حکیمانہ انداز میں دیا ہے، اُس کے نزدیک اس تمام غفلت اور محرومی کا باعث انسان کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشات اور دنیا کی رنگا رنگ دلفریبیاں ہیں، وہ کہتا ہے۔

"بچہ زندگی کی شاہراہ میں جوں جوں قدم آگے بڑھاتا ہے، اس زندان (دنیا) کی ہولناک تاریکیاں سیاہ بادلوں کی طرح اُس پر

چھانے لگتی ہے، لیکن پھر بھی جب فطرت کی تجلیاں اس کے سامنے ایک حسین ندی کی مثل بہتی ہیں، تو وہ انہیں دیکھ کر نہایت مسرور ہوتا ہے، پھر جب یہ بچہ جوان ہوتا ہے، تو اب بھی فطرت اس کو ہر طرح سے محبوب رکھتی ہے اور اس کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے اپنی پاکیزہ روشنی کو اُس کے قدموں پر بکھیرتی چلی جاتی ہے، لیکن آخر کار جب وہ اس کی پروا نہیں کرتا اور بے التفاتی سے کام لیتا ہے، تو وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر رخصت ہو جاتی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی اور طغیان میں اپنے ہم جنسوں کی صحبت سے متاثر ہو کر انہیں کی طرح ایک چوپایہ اور حیوان مطلق ہو کر رہ جاتا ہے۔

اب اس کی غفلت کا سبب پوچھو۔ تو روئے زمین کی یہی چند در چند لذات ہیں، یہ زمین گویا ایک شفیق ماں یا ایک مہربان خادمہ کی طرح جو بذات خود اپنے بچے کی پرورش میں کوئی بُری نیت نہیں رکھتی۔ اس کو اپنے آغوش میں جذب کرنے لگتی ہے اور اس طرح سے محبت اور شوق کی میٹھی لوریاں دے دے کر فطرت کا پیغام اُس سے فراموش کرا دیتی ہے، وہ اپنی ممکنات سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے اور اُسے یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کیسا شاندار ماضی تھا جس سے میں اب سراسر محروم کر دیا گیا ہوں"۔

دنیا میں آج مذہب کے جھگڑے بہت عام ہیں، تکفیر کا بازار گرم ہے، اور ہر شخص اپنے کو راہِ راست پر بتلاتا ہے، لیکن ورڈس ورتھ

کہتا ہے کہ درحقیقت انسان کا قدرتی اور پیدائشی مذہب فطرت کی ہدایات ہیں، جن پر کاربند ہوتے ہوئے نہ صرف تمام جھگڑوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، جن کی پیروی سے نہ صرف اعلیٰ درجہ کے اخلاقی اور عملی فوائد حاصل ہوتے ہیں، بلکہ نتیجہ کار وہی مذہب ہماری اُخروی نجات کا بھی بہترین وسیلہ ہے!

علم النفس نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان اپنے جذبات واحساسات کی رو سے نہایت سریع الاثر اور ذکی الحس واقع ہوا ہے، اس کا اُن تمام احساسات یا تصوّراتِ ذہنی کو ایک منظم صورت میں قائم رکھنا۔ اور اس کے بعد انہیں اپنی فلاح و بہبود کے لئے استعمال میں لانا، اُسے حقیقی معنوں میں انسان بنا سکتا ہے، ایسا انسان جو انسانیت کا انتہائی مظہر ہے جو قوانین فطرت کا محافظ ہے اور جس پر خدا کو بھی بجا طور پر ناز ہونا چاہیئے ۔

قدم در جستجوئے آدمے زن   خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اصل میں سچ پوچھئے تو ہماری اخلاقیات کا لُبِ لباب اور کامیابی کا صحیح راستہ ہی ہمارے جذبات کی صحیح تنظیم میں ہے، اس طرح سے ہم نہ صرف دنیا کی حسین چیزوں ہی سے زندگی کے لئے اچھے اچھے سبق حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ اس طور پر یہاں کی قبیح اور ناخوشگوار اشیا بھی ہمارے لئے خضرِ راہ کا کام دے سکتی ہیں۔ چنانچہ رچرڈ لولیس اس بنا پر کہتا ہے :۔

Stone walls do not a prison make,
Nor iron bars a cage,
Minds innocent and free take,
That for a hermitage.

"یہ ضروری نہیں کہ جس کمرے کی دیواریں پتھر کی ہوں، یا جو ہر اسیر لوہے کی سلاخوں سے تیار کیا گیا ہو، ہمیشہ قید خانہ ہی کہلاتے کیوں کہ آزاد، بے خوف اور معصوم دل رکھنے والے لوگ ایسی جگہ کو بھی اپنے نزدیک ایک حجرہ تصوّر کر لیتے ہیں جہاں وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر عبادت کر سکیں۔"

گویا اس کا مدعا یہ ہے کہ:۔

Mind is its own place, and
in itself,
Can make a heaven of hell,
a hell of heaven.

"یعنی دل بھی فی الحقیقت ایک مستقل دنیا ہے جو اگر چاہے تو دوزخ سے بہشت بنا سکتا ہے اور بہشت سے دوزخ!"

خود اقبال نے بھی "اسرار" میں انسانی حواس کے اس باریک نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ ؎

سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد
شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد
نقدِ جان خویش بار ہزن سپرد

"یعنی جب پتھر نے اپنی نسبت شیشہ ہونے کا گمان کیا، تو فقط اس کا یہ گمان ہی اس کی تباہی کا سبب بن گیا اور اسی طرح جب کسی مسافر نے خود کو ناتواں اور کمزور خیال کیا، تو صرف اس کا یہ احساس ہی اس کی موت اور ہلاکت کا باعث ہوا۔"

اور دوسری جگہ ے

دلِ بیباک راضرغام رنگ است | دل ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نہ داری بحر صحرا است | دگر ترسی بہ ہر موجش نہنگ است

اب اس رباعی کے الفاظ پر نظر رکھتے ہوئے آپ ہی فرمائیے کہ بے خوف انسان کے لئے کیوں شیر جیسا خونخوار درندہ بھی ایک بھیڑ سے زیادہ غیر وقیع ہے، اور کیوں بزدل انسان کو ایک معمولی ہرن چیتے سے زیادہ خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ کیوں ایک بہادر شخص کے نزدیک سمندر جیسا وحشت ناک سفر بھی آسانی سے طے کر لینے کے قابل ہے اور کیوں وہی مقام ایک ڈرپوک انسان کے لئے قدم قدم پر تکلیفوں اور مصیبتوں کا پیامبر ہے، موسیٰ کیوں پورے اطمینان کے ساتھ دریائے نیل کو عبور کر لیتے ہیں، اور فرعون اس ساز و سامان کے باوجود اس میں قدم رکھتے ہوئے کیوں گھبراتا ہے۔ ایک ہی چیز ابراہیم کو گلزار کیوں دکھائی دیتی ہے اور آذر اسی کو دوزخ سمجھ کر کیوں دور بھاگتا

ہے؟ گذشتہ بیان کے مطابق یہاں بھی کہنا پڑے گا کہ یہ سب انسانی "اعتقاد" کی کرشمہ سازیاں ہیں اور یہ تمام نتائج انسان کے "تصوراتِ ذہنی" سے مرتب ہوتے ہیں، پس ان شواہد کے بعد آپ خود بخود اندازہ فرما سکتے ہیں، کہ خودی کی تربیت اور اس کے نشو و ارتقا میں "تصور" یا "خیال" کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے!

تو انسان کے ان جذباتی خصائص کو پیش نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوا کہ خودی کو درجۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے "عزتِ نفس" اور "ضبطِ نفس" دو نہایت ضروری شرائط ہیں اور ان شرائط کی رُو سے خودی کی تمام تر صفات اسی ایک شعر پر مبنی خیال کی جائیں گی ؎

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساران زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

خزیدگی اور استحکام بجائے خود ایسی پائدار اور قابلِ تعریف چیزیں ہیں اور کمزوری و ناتوانی اس قدر قابل مذمت صفات، کہ خود قدرت نے بھی نظامِ دنیوی سے ایک کا عروج اور دوسرے کی پستی ثابت کر دی، بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو ہڑپ کر جاتی ہیں، چڑیاں اور کبوتر، باز اور شاہین کا لقمہ بنتے ہیں، جمادات، نباتات کی غذا بنتے ہیں، نباتات، حیوانات کی اور پھر حیوانات بھی اشرف یعنی انسان کی خدمت گزاری کے لئے اجل کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسی طرح دنیا کا یہ کارخانہ جاری ہے۔ مولانا روم نے گویا اسی مقصد کو

اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ ؎

جملہ عالم آکل و ماکول داں

یعنی کائناتِ عالم کی جملہ اشیا ایک دوسرے کی زندگی پر بسر اوقات کر رہی ہیں۔ ضعف و قوت کا یہی فلسفہ اور غالب مغلوب کی یہی بحث ہے جس کے زیر اثر ڈاکٹر صاحب "بال جبریل" میں فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری[1]
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اُسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران[2] و لزوم[3] مات
اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات[4]

---

[1] ابوالعلا معری عربی زبان کا مشہور شاعر ہے

[2] رسالہ الغفرانِ معری کی مشہور تصنیف ہے

[3] معری کا مجموعہ قصائد [4] فوری موت

جب دوسری تمام چیزیں اس حکم سے نجات نہیں پا سکتی تھیں تو انسان کو اس سے کیوں مستثنےٰ کر دیا جاتا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ یہ ہستی اس قانون کا سب سے زیادہ تختہ مشق بنی ہوئی ہے اور عصر حاضر نے اس کشمکش کو انتہائی شدت سے نمایاں کر دیا ہے، آج کا زمانہ گذشتہ زمانوں سے بڑھ کر استبداد کا زمانہ ہے۔ آج انسانی قلوب پر کیریکٹر حکومت نہیں کرتا، بلکہ مشینیں، کلیں، طرح طرح کے مہلک ہتھیار اور ان کی بھیانک آوازیں حکومت کرتی ہیں، آج افراد سے گذر کر قاہر اور توانا قومیں بھی، ناتواں اور عاجز قوموں کو فنا و برباد کر دینے پر تلی ہوئی ہیں، اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضعیفی اور بیچارگی صرف انسانوں کے نزدیک ہی نہیں بلکہ خدا کے نزدیک بھی ایک بدترین اور ناقابلِ عفو جرم ہے، خطرات ہر طرف منڈلا رہے ہیں، حال میں اٹلی، جبشہ کو اسی ہوس کے ماتحت جذب و ہضم کر گیا ہے، عبرت ایسے واقعات پر آنسو بہاتی ہے۔ مگر غم کے اظہار سے ظلم کا سر نیچا نہیں ہوتا، بلکہ اُس کو اور زیادہ جرأت کا موقع مل جاتا ہے، ان حالات میں ہم بخوبی معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ خودی کا استحکام بقائے حیات اور حفظِ ناموس کے لئے کس قدر ضروری چیز ہے۔

خودی کے نفسیاتی خصائص اور باطنی وجوہات پر روشنی ڈال چکنے کے بعد اب ہم علامہ اقبال کے کلام پر اس موضوع کے ماتحت پوری تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

"اسرارِ خودی" میں یہ حکایت پیش کی گئی ہے کہ ایک شخص مرد سے لاہور آیا اور سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے شکایت کی کہ میں دشمنوں سے تنگ آگیا ہوں اور وہ اپنے سنگِ ستم سے میرے شیشۂ دل کو پاش پاش کئے دیتے ہیں، اس لئے مجھے کوئی ایسی تدبیر بتلائیے کہ میں اُن سے بے خوف ہوکر اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکوں، اس کے جواب میں جو کچھ انہوں نے ارشاد فرمایا۔ وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور تقریباً خودی کی تمام صفات کو حاوی ہے، ہم اس جواب کو تمام و کمال یہاں نقل کئے دیتے ہیں ؎

گفت اے نامحرم از رازِ حیات — غافل از انجام و آغازِ حیات
فارغ از اندیشۂ اغیار شو — قوتِ خوابیدہ بیدار شو
سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد — شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد
ناتواں خود را اگر رہرو شمرد — نقدِ جانِ خویش با رہزن سپرد
تا کجا خود را شماری ماو طین — از گِلِ خود شعلۂ طور آفریں
با عزیزاں سرگراں[۱] بودن چرا — شکوہ سنجِ دشمناں بودن چرا
راست میگویم عدو ہم یارِ تست — ہستیٔ او رونقِ بازارِ تست

---

[۱] سرگراں محاورہ ہے ناراض ہونے کے مفہوم میں، جیسے غالب نے کہا ہے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

هر کہ دانائے مقاماتِ خودی ست
فضلِ حق داند اگر دشمن قوی ست

کشتِ انسان را عدو باشد سحاب
ممکناتش را بر انگیزد ز خواب

سنگِ رہ آب ست اگر ہمت قوی ست
سیل را پست و بلندِ جادہ چیست

سنگِ رہ گردد فسانِ[1] تیغِ عزم
قطعِ منزل امتحانِ تیغِ عزم

مثلِ حیوان خوردن آسودن چہ سود
گر بخود محکم نہ بودن چہ سود

خویش را چوں از خودی محکم کنی
تو اگر خواہی جہاں برہم کنی

گر فنا خواہی ز خود آزاد شو
گر بقا خواہی بخود آباد شو

چیست مردن از خودی غافل شدن
تو چہ پنداری فراقِ جان و تن؟

در خودی کن صورتِ یوسف مقام
از اسیری تا شہنشاہی خرام

از خودی اندیش و مردِ کار شو
مردِ حق شو حاملِ اسرار شو

اس کے بعد ایک پرندے کی حکایت کا ذکر ہے کہ وہ پیاس سے بے تاب ہو رہا تھا، اس لئے ریزۂ الماس کو اُس نے پانی کا قطرہ تصوّر کیا، اور اس پر ہوس کی منقار تیز کرنا چاہی، لیکن وہ چونکہ سخت تھا، خود دار تھا، اس لئے مایوس ہونا پڑا۔ پھر ساتھ ہی اُسے ایک پھول پر شبنم کا قطرہ دکھائی دیا، اس کی طرف بڑھا اور وہ چونکہ خام تھا، ایک عارضی اور فانی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے بے اختیار اس پرندے کے حلق میں ٹپک پڑا۔ ڈاکٹر صاحب اس واقعہ کو جس خوبی اور نزاکت

---

[1] تلوار اور چھری تیز کرنے کا پتھر

کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں، وہ اس قابل ہے کہ آپ کو اُس سے محظوظ کیا جائے۔ فرماتے ہیں ؎

طائرے از تشنگی بے تاب بود
در تنِ او دم مثالِ موج دود
ریزۂ الماس در گلزار دید
تشنگی نظارۂ آب آفرید
از فریبِ ریزۂ خورشید تاب
مرغِ ناداں سنگ را پنداشت آب
مایۂ اندوزِ نم از گوہر نشد
زد بروِ منقار کامش تر نشد
گفت الماس اے گرفتارِ ہوس
تیز بر من کردہ منقارِ ہوس
قطرۂ آبے نیم ساقی نیم
من برائے دیگراں باقی نیم
قصد آزارم کُنی دیوانۂ
از حیاتِ خودنما بیگانۂ
آبِ من منقارِ مرغاں بشکند
آدمی را گوہرِ جاں بشکند
طائر از الماس کامِ دل نیافت
روئے خویش از ریزۂ تابندہ تافت
حسرت اندر سینہ اش آباد گشت
در گلوئے او نوا فریاد گشت
قطرۂ شبنم سرِ شاخِ گلے
تافت مثلِ اشکِ چشمِ بلبلے
تابِ او محوِ سپاسِ آفتاب
لرزہ بر تن از ہراسِ آفتاب
کوکبِ رم خوئے گردوں زادۂ
یکدم از ذوقِ نمود استادۂ
صد فریب از غنچہ و گل خوردۂ
بہرۂ از زندگی نا بردۂ
مثلِ اشکِ عاشقِ دل دادۂ
زیبِ مژگانے چکیدن آمادۂ
مرغِ مضطر زیرِ شاخِ گل رسید
در دہانش قطرۂ شبنم چکید
ایکہ می خواہی ز دشمن جاں بری
از تو پرسم قطرۂ یا گوہری؟

چوں زسوزِ تشنگی طائر گداخت
از حیاتِ دیگرے سرمایہ ساخت
قطرہ سخت اندام و گوہر خو نبود
ریزۂ الماس بود و او نبود
غافل از حفظِ خودی یک دم مشو
ریزۂ الماس شو شبنم مشو
پختہ فطرت صورتِ کہسار باش
حاملِ صد ابرِ دریا بار باش
خویش را دریاب از ایجاب خویش
سیم شو از بستنِ سیماب خویش
نغمۂ پیدا کن از تارِ خودی
آشکارا راز اسرارِ خودی

ان اشعار میں دو چیزیں خاص طور پر قابل غور ہیں، ایک تو یہ کہ جہاں حضرت علّامہ کو خودداری اور استحکام کا سبق دینا منظور ہوتا ہے وہاں ریزۂ الماس کی نسبت نہایت موثر اور خوفناک چیزوں کا ذکر فرماتے ہیں، مثلاً الماس کا یہ کہنا کہ بظاہر اگرچہ میں بڑا خوبصورت اور خوشنما معلوم ہوتا ہوں لیکن اُس پر کوئی دھوکا نہ کھاجائے، کیونکہ میری یہ چمک بھی پرندے کی چونچ توڑ دے گی اور اسی طرح انسان میرا قصد کرے گا۔ تو میں اُسے ہلاک کر ڈالوں گا، ان تمام باتوں سے خودداری کا ثبوت ملتا ہے، اس طرح جہاں مجبوری اور بے اختیاری کا ذکر منظور ہے، وہاں قطرۂ شبنم کی نسبت مرزا غالبؔ کی طرح ؎

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

ضعف اور کمزوری کا اظہار کیا ہے۔ اور پھر اس نابود قطرے کو چشم بلبل کا آنسو قرار دینا نہ صرف حسنِ تشبیہ کی انتہا ہے۔ بلکہ اس سے بھی اس کی کمزوری اور مجبوری کا ثبوت ملتا ہے ؎

قطرۂ شبنم سرِ شاخ گلے
تافت مثلِ اشک چشم بلبلے

بلبل کے ساتھ ہی جب پھول کا بھی ذکر آ گیا، تو بات کا اثر کچھ سے کچھ ہو گیا، اور پھر دوسری جگہ اسی قطرے کو کسی حرماں نصیب عاشق کے آنسو سے تعبیر کرنا، جو پلکوں سے ٹپک جانے کے لئے بالکل تیار ہو، بے اختیاری کی ایک نئی صورت ہے۔ الغرض یہ تمام تشبیہیں اور اندازِ بیان کی مختلف صورتیں، ضعف اور مجبوری کے نقائص ظاہر کرنے کے لئے ہیں، جو خودی کے سراسر منافی ہے!

خودی کے متعلق یہ تو فارسی مثنوی کے اشعار تھے، لیکن اُردو کے تازہ مجموعۂ کلام بالِ جبریل کے "ساقی نامہ" میں بھی اس کی نسبت بہت اچھے تاثرات پائے گئے ہیں، یہ مثنوی اپنے تسلسل اور شستگی کی بنا پر میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا سا لطف دیتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو ؎

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم[1] کا راز ہے
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بیرنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

---

[1] تقویم بمعنی جنتری۔ کتاب

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے[1]
خودی کے نگہبان کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرد فال محمود سے درگذر
خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائق اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیر فرمانِ موت

---

[1] تشبیہ نہایت نادر اور دلچسپ واقع ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح آسمان اپنی وسعت کے باوجود آنکھ کے تل جیسی چھوٹی اور نامعلوم جگہ میں محو ہو گیا ہے اسی طرح دل چھوٹا ہونے کے باوجود خودی کے ہنگامہ خیز تاثرات کو قبول کر لینے کے لئے بالکل کافی ہے۔ منہ

یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاک داں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اُس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار[1] کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

حملہ

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس
اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّٰی بسوزد پرم

اور خودی کی اسی عظمت کے پیشِ نظر ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلّیٔ دگرے در خورِ تماشا نیست
اگرچہ عقلِ فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نہ باش کہ عشق تنہا نیست

یعنی ؎

گرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّٰی زار میں آباد ہو

اور اسی طرح ؎

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

اور یہی وجہ ہے کہ ؎

منکرِ حق نزدِ ملّا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تر است
آں بانکارِ وجود آمد عجول
ایں عجول و ہم ظلوم و ہم جہول

عجول لغوی حیثیت سے ایک حیران اور درماندہ شخص کو کہتے ہیں پس دہری کی بھی یہی کیفیت ہوا کرتی ہے کہ جب اُس کی عقل ذاتِ خداوندی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تو وہ عالمِ اسباب میں حیرت زدہ ہو کر اس سے انکار کر بیٹھتا ہے۔ یا دوسری حیثیت سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہستی باری تعالیٰ کے انکار میں "عجلت" اور "جلد بازی" سے کام لیتا ہے۔ بہر کیف مفہوم ہر دو لحاظ سے ٹھیک ہے۔ باقی رہی "ظلوم" اور "جہول" کی عقدہ کشائی تو وہ مجھے اشارہ معلوم ہوتا ہے اس آیت کی طرف انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰتِ و الارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا و حملہا الانسان ط انہ، کان ظلوماً جہولا ط یعنی ہم نے احکامِ الٰہیہ کی یہ مقدس امانت (قرآن مجید) آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کے سپرد کرنا چاہی، لیکن وہ اس ذمہ داری کی تاب نہ لاکر ڈر ے۔ اور اس لئے انکار کر دیا۔ پھر اس شے کو اٹھایا تو کس نے؟ حضرت انسان نے! ہاں، اس میں تو شک نہیں کہ انسان نے بڑی جرأت کی، بڑی ہمت سے کام لیا اور ایک ایسی چیز قبول کر لی جس کی متحمل کائنات

کی کوئی دوسری شے نہیں ہو سکتی تھی، لیکن یاد رہے کہ اس کے مندرجہ احکامات کی تعمیل نہ کرنے کی صورت میں انسان جیسا ظالم، جاہل اور بدعہد بھی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اب آپ سمجھے کہ ڈاکٹر صاحب خودی کے منکر کو ایک دہری اور ملحد شخص سے بھی زیادہ بُرا کیوں قرار دیتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ صرف خدا کا منکر ہے اور یہ کتابِ مجید میں انسان کے مذکورہ فضائل سے اغماض کرتے ہوئے نہ صرف خدا کا منکر ہے، بلکہ اس کے ساتھ ذاتی قوتوں کا بھی منکر ہے، فطرت کا منکر ہے، تسخیر، کامیابی، عزتِ نفس یقین، جرأت اور ایسی ایسی تمام صفاتِ حمیدہ کا منکر ہے، سو جس شخص میں بیک وقت اس قدر خباثت اور اس قدر کمزوریاں جمع ہو جائیں اس کے کافر و زندیق ہونے میں شک و شبہ کی کون سی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

اسی طرح "پیامِ مشرق" میں ارشاد ہوتا ہے ؎

زہے در سینۂ انجم کشائی ولے از خویشتن ناآشنائی
یکے بر خود کشا چوں دانہ چشمے کہ از زیرِ زمیں نخلے برآئی

اللہ اکبر! خودی کی اس سے بہتر تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے کہ ؎

برون از ورطہ[۱] بود و عدم شو
فزوں تر زیں جہانِ کیف و کم شو

---

[۱] ورطہ بمعنی بھنور

خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش
چو ابراہیم معمارِ حرم شو

پھر فرماتے ہیں ؎

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جانِ تو ز خود نا محرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

آخری مصرع کے اندر تو گویا خودی کے تمام احساسات کو بند کر دیا ہے، ترغیب کی اس سے بہتر صورت ممکن نہیں! ان تمام مباحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد "معرفتِ نفس" یا "خود شناسی" ہے۔ بھلا وہ شخص زندگی میں کیا ترقی حاصل کرے گا، جو ہمیشہ دوسروں ہی کا متوالا رہا، اُن کے سنگریزوں کو تو جواہرات سے زیادہ قیمتی خیال کیا اور اپنے یہاں کے جواہرات کو سنگریزوں سے زیادہ غیر وقیع اور ناکارہ سمجھ کر ٹھکرا دیتا رہا؟ یہی وجہ ہے کہ نٹشے بھی انتہائی تشدد کے ساتھ ایک جگہ کہتا ہے :-

"دنیا صرف اُن لوگوں کے گرد چکر لگاتی ہے، جو اپنے اندر تخلیقی اور ایجادی قوت رکھتے ہوں، اگرچہ اس کا اس طریق پر گھومنا اور چکر لگانا ہمیں نہ بھی دکھائی دیتا ہو!

صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ تمام کی تمام قوم اور ہر قسم کی شان و شوکت ان کی مطیع اور منقاد ہے اور ہر وقت ان کی قدم بوسی کے لئے تیار

رہتی ہے، یہ ہے زندگی کا حقیقی استحکام !

جس مردِ خدا کی غیرت اور خودداری کا یہ عالم ہو، وہ گو اپنے جسم کے اندر جان رکھتا ہے، لیکن مقاصد کی تعمیل میں وہ اس جان کی پروا مطلق نہیں کرتا، اس کا اعتقاد ہمیشہ اس شے کی نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے جس سے وہ دوسروں کے اعتقاد کو بھی راسخ اور مضبوط بنا سکے، یعنی وہ صرف "اپنی" ذات پر اعتماد کرتا ہے !

اس کے یقین اور ایمان کی یہ حالت ہے۔ کہ اگر آج اس کا وزن ایک رتی ہے تو کل ایک من ہوگا اور اگر کل ایک من ہے، تو پرسوں دس من ہوگا، وہ اپنی طبیعت میں جماعت کی طرح نہایت ذکی الحس اور سریع الاثر واقع ہوا ہے، اور پھر اسی تیزی کے ساتھ وہ حالات کی کایا بھی پلٹ سکتا ہے !

چیزوں کو تہس نہس اور برباد کر دینے کا مطلب اس کے نزدیک یہ ہے کہ وہ اپنی بے پناہ قوت کا ثبوت دے رہا ہے، اور اپنے مقصد کی طرف دیوانہ وار بڑھنے سے یہ پایا جاتا ہے، کہ وہ لوگوں کو اپنے استقلال اور زور آزمائی کا قائل بنا کے چھوڑے گا۔ وہ ایسا جواں مرد اور بہادر ہے کہ بے دریغ خون بہا دینے کے علاوہ کسی اور بات پر کان دھرنا بھی اُسے گوارا نہیں![1]

اس طرح ایک دوسری جگہ کہتا ہے:۔

---

[1] خطبات زرتشت عنوان "مارکیٹ کی مکھیاں"

"کیا تو ایک نئی طاقت، اور نیا حق نہیں ہے؟ کیا تجھے ہم سب سے تیز اور سب سے آگے بڑھ جانے والی موٹر تصوّر نہ کریں؟ کیا تو وہ پہیا نہیں ہے، جو خود بہ خود رواں ہوتا ہو، اور کیا تیری قوتِ تسخیر اپنے اندر یہ شان نہیں رکھتی کہ تو ستاروں کو بھی اپنے گرد چکر لگانے پر مجبور کر سکے!

کیا تو ایسی مافوق العادت ہستی نہیں ہے، جو اپنے خیر و شر کی مختار خود ہو اور جس نے اپنے "ارادے" ہی کو خدا کی مشیت اور اپنی تقدیر قرار دے لیا ہو؟ کیا تو خود ہی اپنا واضع قوانین اور خود ہی اپنا منصف اور فیصلہ کنندہ نہیں بن سکتا؟ کیا تیری ہمت ایسی ہی پست اور تیرے عناصر ایسے ہی مضمحل ہیں؟

یاد رکھ کہ تجھے اپنے آپ کو پختہ اور مضبوط بنانے کے لئے پہلے پہل خود کو اپنے ہی شعلہ میں گرا کر بھسم بنا دینا ہو گا۔ کیونکہ تو اس وقت تک نیا اور خالص نہیں بن سکتا، جب تک ایک دفعہ جل کے راکھ نہ ہو جائے۔"[۱]

خودی کی اس گفتگو میں ڈاکٹر صاحب کی یہ رباعی بھی اپنی نظیر آپ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

من از بود و نبودِ خود خموشم | اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
و لیکن ایں نوائے سادہ کیست | کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

---

[۱] خطبات زرتشت عنوان "خود نمائی"

یہ ایک خالص وجدانی جذبہ تھا، جسے علامہ موصوف نے گنتی کے چند لفظوں میں ادا کر دیا ہے، حالانکہ اس پر ایک ضخیم کتاب بھی لکھ دی جاتی تو حق ادا نہ ہو سکتا اور مضمون پھر بھی تشنہ رہ جاتا۔ اس میں بات صرف اتنی ہے کہ "خودی" اور "تکبر" میں فرق ظاہر کیا گیا ہے، اس مسئلہ کی نزاکت اہلِ نظر حضرات پر ظاہر ہے، لیکن جس بلاغت اور خوبی کے ساتھ اسے حل کیا گیا ہے۔ وہ بھی حد درجہ قابلِ داد ہے۔ یہ گویا خودی کا اثبات بھی ہے اور کبر کی نفی بھی!

ٹیگور نے اسی لطیف احساس کو اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:-

"موعودہ مقامِ ملاقات پر آنے کے لئے تمام راستہ میں نے تو تنہا ہی طے کیا، لیکن یہ کون ہے جو اس خاموش تاریکی میں میرے ساتھ ساتھ آرہا ہے۔ میں اس سے بچنے کے لئے الگ ہٹتا ہوں۔ لیکن نہیں بچ سکتا۔" [۱]

پھر اسی مفہوم کو لیتے ہوئے دوسری جگہ کہتا ہے:-

"اگرچہ میں تجھے اپنی دعاؤں میں نہیں پکارتا، ہر چند میں تجھے اپنے قلب میں جگہ نہیں دیتا، تاہم تیری محبت میری محبت کا انتظار کر رہی ہے۔" [۲]

---

[۱] گیتان جلی ص ۵۲

[۲] گیتان جلی ص ۵۴

یعنی میں بذاتِ خود کتنا ہی غافل کیوں نہ ہوں میرا نفس اور میری فطرت ایک ازلی اور پیدائشی حکم کے ماتحت مجھے حفظِ خودی، اور احساسِ خودی پر مجبور کرتی ہے۔ آج کتنے کم ظرف اور جاہل لوگ ایسے ہیں جو خودی کے محافظ کو بڑی بے باکی سے مغرور اور متکبر قرار دے لیا کرتے ہیں، انہیں چاہیئے کہ دوسروں کو مطعون کرنے سے پہلے اپنے کفر اور حماقت کا کچھ علاج سوچیں!

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ خودی قیدِ زمانی اور قیدِ مکانی دونوں سے آزاد ہے، اس کے لئے نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا، اس کی ممکنات غیر محدود ہیں ؎

زآغازِ خودی کس را خبر نیست
خودی در حلقۂ بود و عدم نیست
زخضر این نکتۂ نادر شنیدم
کہ بحر از موجِ خودی دیرینہ تر نیست

مطلب اس کا یہ ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی اور بنی آدم میں سوزِ عشق نے اپنا ظہور کیا، خودی بھی اُسی وقت سے جلوہ نما ہے۔ زمانے کے نشیب و فراز سے اسے کوئی تعلق نہیں، اس رباعی میں سلسلۂ ہستی کو بحر سے اور خودی کو موج سے استعارہ کیا گیا ہے!

اسی طرح "زبورِ عجم" میں بھی خودی کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگزر
کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

الغرض ضرورت اس کی ہے کہ وقت کو غنیمت سمجھتے ہوئے خودی کی تکمیل کر لی جائے۔ ورنہ ڈر ہے کہ یہ عمر دوروزہ کہیں بے وفائی نہ کر جائے ؀

ز خاکِ خویش بہ تعمیرِ آدمے برخیز
کہ فرصتِ تو بقدرِ تبسّمِ شرراست

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ جو عبادت انسان کرتا ہے۔ اُس کا مقصد بھی تکمیلِ خودی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ علامہ موصوف نے ایک جگہ فرمایا ہے ؀

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

یعنی عبادت کے معاملہ میں جنت و دوزخ کا سوال درمیان سے بالکل اٹھا دینا چاہیئے۔ بلکہ اس سے غرض خودی اور صرف "خودی" کی تکمیل ہے۔

غالبؔ نے اس لئے کہا تھا کہ ؀

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اب اگر آپ اس معنی کی مزید توضیح چاہتے ہیں تو ذیل کے چند

اشعار پر نظر ڈالیے ان میں زاہدوں کی اقسام اور اُن کے مختلف مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے عبادت کا صحیح نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ ؎

خلقِ خدا کہ خدمتِ دادار می کنند
هستند ہر سہ قسم کہ ایں کار می کنند
قسمے شد از پے جنتِ خدا پرست
دیں رسم و عادتے است کہ تجار می کنند
قومے دگر کنند پرستش زبیم او
دیں کارِ بندگان است کہ احرار می کنند
جمعے نظر ازیں دو جہت قطع کردہ اند
برکارِ ہر دو طائفہ انکار مے کنند
چوں غیر خویش مرکزِ ہستی نہ یافتند
برگردِ خویش دور چو پرکار می کنند
ایں است راہِ حق کہ سیم فرقہ می روند
سیر و سلوکِ راہ بہ ہنجار می کنند

پس معلوم ہوا کہ عبادت کا صحیح نصب العین تکمیل خودی کے سوا اور کچھ نہیں، اور یہ تو خود ڈاکٹر صاحب کی طرف سے بھی کہا جا چکا ہے۔

کم خورد کم خواب وکم گفتار باش
گردِ خود گردندہ چوں پرکار باش

تقدیر کے مسئلے نے بھی مسلمانوں کو بہت دھوکا دیا جس کے

غلط مفہوم سے ان کے قوائے عملیہ بالکل مشل ہو کر رہ گئے ہیں۔ عام طور پر تقدیر کے جو معنی سمجھے جاتے ہیں، وہ مجبوری اور بے چارگی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت خودی اور عزتِ نفس کے سراسر منافی ہے، ایسے خیالات روح کو مردہ اور جذبات کو افسردہ کر دینے والے ہیں۔ جب کمزوری اس حد تک پہنچ جائے، تو خودی کیونکر برقرار رہ سکتی ہے؟ بس یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال بھی تقدیر کے عام مفہوم کی سخت تردید فرماتے ہیں اور ان کے نزدیک تقدیر یقین و اختیار کے سوا کسی دوسری چیز کا نام نہیں ہے، چنانچہ "پیامِ مشرق" میں فرماتے ہیں ؎

بپائے خود مزن زنجیرِ تقدیر — تہِ ایں گنبدِ گرداں رہے ہست
اگر باور نہ داری خیز و دریاب — کہ چوں پا وا کنی جولانگہے ہست

اسی طرح "جاوید نامہ" میں بھی اسی باریک نکتے کا حل فرماتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

از ضیاں نقدِ خودی در باختند[1] — نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمزِ باریکش بحرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا — سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست
قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست

پس ظاہر ہے کہ تقدیر کا فیصلہ بھی ہر شخص کی اپنی ہمت پر موقوف

---

[1] در باختن۔ ہار جانا

ہے، جو بلند ہمت ہیں وہ اس کا قوی پہلو اختیار کر کے اوجِ کمال پر پہنچ جاتے ہیں اور جو پست ہمت ہیں وہ اس کا ضعیف پہلو اختیار کر کے ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت میں جا پڑتے ہیں۔ غالبؔ مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

اور اس بنا پر کیوں ایک مردِ کامل خودی میں ایک ایسا ضابطہ اور ایک ایسی جابرانہ شان پیدا نہ کر لے کہ خدا بھی اپنی مشیت اور اپنے ارادے کو اس کی رضامندی اور خوشنودیٔ طبع کے لئے بدل ڈالے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مولانا حالیؔ کا ارشاد ہے ؎

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار
دیکھا تو نہ تھا کچھ اُس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور
جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

اسی طرح "بالِ جبریل" میں بھی مریدِ ہندی پیرِ رومیؔ سے استفسار کرتا ہے ؎

اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر
میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

پیر رومی کی طرف سے جواب ملتا ہے ؎

بال بازاں را سوئے سلطاں برد
بال زاغاں را بگورستان برد

یعنی خدائے تعالیٰ نے توفیق اور قوت سب کو ایک جیسی عطا کی ہے اور ذرائع کو بھی کسی ایک شے کے ساتھ محدود اور معین نہیں رہنے دیا۔ اس لحاظ سے اس کی تقسیم سراسر عدل اور انصاف پر مبنی ہے، لیکن آگے مخلوق کا اپنا اپنا "ظرف" ہے کہ اس قوت کو جتنا اور جس قدر چاہیں استعمال میں لائیں۔ گویا مولانا حالی کا وہی سادہ اور دل نشیں قول ہے کہ ؎

جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور
جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

تقدیر کا مسئلہ چونکہ ایک ایسی شے ہے، جو مسلمانوں کے لئے بالخصوص اور دیگر اقوام کے لئے بالعموم تشویش اور پریشانی کا موجب رہا ہے، اس لئے ہم اس بحث کو اتنے ہی پر ختم نہیں کر دینا چاہتے، اگر ہمیں اس حقیقت کا اندازہ ہو جائے کہ اس کا غلط پہلو خودی کو کس قدر ضعف پہنچاتا ہے، تو اس پر جتنی بھی روشنی ڈالی جائے کم ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ "جبریہ" نے افعال کا حاکم اور مختار سراسر خدا کو سمجھا، اور خود معطل اور مایوس ہو کر بیٹھ گئے اور اس لحاظ سے عمل اور کامیابی کی بجائے حسرت اور بے کاری کو اپنا مسلک قرار دیا؟ یہ ایک

انتہائی کفرانِ نعمت ہے۔ جو کسی بندے سے سرزد نہ ہو سکے!۔۔۔ پھر کیا اسلام میں دوسری جانب یہ خطرناک فتنہ برپا نہیں ہوا کہ "قدریہ" نے اپنے ہی کو "مختارِ کل" تصور کرتے ہوئے خدا اور تقدیر کا سرے سے انکار ہی کر دیا۔ یہ وہ فرعونیت اور احسان فراموشی ہے جس کی تائید دنیا کا کوئی ذی شعور انسان نہیں کر سکتا، پھر آخر یہ افراط و تفریط کیوں؟ چاہیئے تو یہ تھا کہ ہلاکت کے ان ہر دو راستوں کو خیرباد کہتے ہوئے ایک ایسی میانہ روی اختیار کی جاتی، جس سے نہ تو انسان سراسر اپاہج اور بے حس ہو کر بیٹھ جاتا، اور نہ شرعی حیثیت سے کفر و الحاد کا کوئی شائبہ پیدا ہوتا، تو اس کی نسبت ہم کیوں مولانا روم ہی سے استفسار نہ کریں کہ وہ ہر ممکن پیرائے سے ہماری تسلی کر دیں گے، چنانچہ پہلے تو وہ مطلق جبر کی دو مختلف صورتیں بیان فرماتے ہیں اور بعد ازاں جبر و اختیار کا صحیح مفہوم واضح کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کی ہیں ؎

لفظِ جبرم عشق را بے صبر کرد
وانکہ عاشق نیست حبسِ جبر کرد
ایں معیت با حق ست و جبر نیست
ایں تجلی مہ ست ایں ابر است
در بود ایں جبر، جبر عامہ نیست
جبر آں امارہ خود کامہ نیست

ؔ۱ نفس لوامہ، نفس مطمئنہ اور نفس امّارہ۔ نفس کی تین قسمیں ہیں۔

حیرا را ایشاں شناسند اے پسر
کہ خدا بکشا د شاں در دل بصر

غیب و آئندہ بر ایشاں گشت فاش
ذکرِ ماضی پیش ایشاں گشت لاش

اختیار و جبر ایشاں دیگر ست
قطرہا اندر صدفہا گوہر ست

ہست بیروں قطرۂ خرد و بزرگ
در صدف آں دُرِّ خرد ست و سترگ

طبع نافِ آہواست آں قوم را
از بروں خوں و اندروں شاں مشکہا

تو مگو کیں ناف بیروں خوں بود
چوں بود در ناف مشکے چوں شود

تو مگو کیں مس بروں بد محتقر
در دلِ اکسیر چوں گشت ست زر؟

اختیار و جبر در تو بد خیال
چوں در ایشاں رفت شد نور جلال

ناں چو در سفرہ ست او باشد جماد
در تنِ مردم شود او روحِ شاد

دردل سفرہ نگردد مستحیل
مستحیلش جاں کند از سلسبیل

قوّتِ جانست ایں اے راستخواں
تا چہ باشد قوتِ آں جانِ جاں

ناں ست قوتِ تن ولیکن درنگر
تا چہ قوتِ جانش باشد؟ اے پسر!

گوشت پارہ آدمی از زورِ جاں
مے شگافد کوہ را بابحر و کاں

زورِ جانِ کوہکن شق الحجر
زورِ جانِ جاں در "انشق القمر"

گر کشاید دل سرِ انبانِ راز
جان سوے عرش سازو ہ نہ کتاز

گر زباں گوید از اسرارِ نہاں
آتش افروزد بسوزد ایں جہاں

یعنی لفظِ "جبر" نے میرے عشق، اور میرے جذبہ عمل میں اک بے پناہ ہیجان پیدا کر دیا اور جس بے چارے کو عشق کی چاشنی کبھی نصیب ہی نہیں ہوتی تھی، وہ اس لفظ کا مقید اور پابند ہو کر بیٹھ گیا، حق تو یہ ہے کہ ایسے جبر کو جبر نہیں کہنا چاہیئے۔ بلکہ یہ تو خدا سے واصل اور قریب تر ہونے کے لئے ایک بہترین زینہ ہے۔ اس کو ہم ایک ایسے چاند

سے تعبیر کریں گے جس کی خوبصورت روشنی سے دل اور نگاہ کو طراوت حاصل ہو، یہ وہ ابر نہیں ہے، جو حقیقت اور صداقت کو ہم سے پوشیدہ کر دے اور بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ جبر ہے، تو اسے ہم نااہل اور عوام لوگوں کا جبر ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے، بلکہ اس جبر کی ممکنات اور ناقابل تسخیر قوتیں اس مقام پر نمایاں ہوتی ہیں، جہاں نفس امارہ کی حیلہ سازیوں کو کوئی دخل نہیں، سچ پوچھو تو جبر کے ان تاثرات کو فقط وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی باطنی آنکھ خدا نے روشن کر دی ہو، یہ وہ لوگ ہیں کہ غیب اور آئندہ کی تمام چیزوں کو اپنے سامنے موجود پاتے ہیں اور عہدِ کہن کی داستانیں ان کے نزدیک تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، ان لوگوں کا جبر اور اختیار اپنے اندر کچھ اور ہی مفہوم رکھتا ہے جو ہمارے اور تمہارے مفروضہ مفہوم سے کہیں بلند ہے، کیا تم دیکھتے نہیں کہ قطرہ صدف میں پہنچ کر گوہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور اُسے "آزادی" اور "اختیار" کی حالت میں بھی وہ عزت اور منزلت حاصل نہیں ہوتی جو "قید" اور "مجبوری" کی حالت میں حاصل ہوتی ہے صدف سے باہر تو اُس کی زیادہ سے زیادہ یہ حیثیت تھی کہ وہ ایک چھوٹا یا بڑا قطرہ تھا، لیکن صدف میں پہنچ کر اُسی قطرہ نے یہ شان پائی کہ وہ چھوٹا یا بڑا "موتی" بن گیا۔ جن لوگوں کی طبیعت اپنے اندر یہ خواص رکھتی ہو، وہ گویا ہرن کی ناف ہیں کہ جو چیز اُن سے باہر ہوتے ہوئے خون کا مرتبہ رکھتی تھی، اُن کے اندر پہنچ کر یعنی محبوس اور مجبور ہو کر وہی شئے

مشک اور عنبر کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اب آپ یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ یہ نافہ اس سے پہلے معمولی خون تھا اور اگر یہ خون تھا تو نافے میں پہنچ کر مشک کیسے ہو گیا؟ اور اس طرح آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تانبا آزاد اور خود مختار ہونے کی صورت میں ایک حقیر سی شے تھا، کیونکہ جب اُسے اکسیر یا کیمیا کا جزو بنا دیا گیا تو وہ سونا کیونکر ہو گیا[1] تو انہیں مثال کی رُو سے سمجھ لو کہ جبر و اختیار تمہاری سمجھ اور ہمت کے مطابق محض نقشِ خیالی تھے، لیکن جب یہی چیزیں ان لوگوں سے متعلق ہوئیں، جو عشق کو اپنا مسلک قرار دیتے ہوئے تھے، تو سراپا جلال اور ہیبت بن گئیں، انسی

---

[1] علامہ اقبال نے بھی "اسیری" کے عنوان سے ایک جگہ یہ حکمت بیان کی ہے اُن کے اشعار ہیں ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

طرح روٹی کی مثال کو دیکھو کہ جب تک وہ دستر خوان پر تھی، اُسے ایک منجمد اور بے کار سی چیز سمجھا جاتا تھا، لیکن وہی جب انسان کے اندر جاتی ہے، تو روح کے لئے تقویت اور تازگی کا باعث ہے، دستر خوان پر ہوتے ہوئے اس روٹی میں کوئی حس و حرکت نہیں تھی، یہ چیز اگر اس کو حاصل ہوئی، تو فقط "روح" اور "زندگی کی برکت سے جس نے خون کے دوران سے اُس کے اجزا کو جسمِ انسانی میں تحلیل کر دیا، یہاں تک تو چیزوں کا تعلق مادی اور جسمانی ضروریات کے ساتھ تھا، اب خیال کرو کہ "روح" جن چیزوں سے براہ راست زندگی اور قوت اخذ کرتی ہے اس کے نتائج اور تاثرات کیسے کچھ محیر العقول اور مافوق العادت نہ ہوں گے، جب روٹی کھا کر جسمِ انسانی میں اس قدر طاقت ہے کہ وہ پہاڑوں اور سمندروں اور معدنوں کا بھی سینہ چیر کر رکھ دیتا ہے.

تو "روحِ انسانی" اور "عشق" کیا کچھ قیامت برپا نہیں کریں گے؟

یہی وجہ ہے کہ فرہاد نے جسمانی قوت سے پتھروں کو ریزہ ریزہ کیا، لیکن اُسی کے بالمقابل جب "عشق" کی باری آئی تو اُس نے ایک ہی اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر کے رکھ دیئے. اتنا کچھ تو ہم نے بیان کیا. لیکن اگر ہم حقائق کو اور بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے لگیں. تو روح اس کی تاب نہ لا کر روئے زمین کو خیر باد کہے اور آنِ واحد میں عرش کی جانب پرواز کر جائے. زبان کے اس چھوٹے سے لوتھڑے کو بھلا کہاں یارا ہے کہ عشق کے اسرار کو پوری طرح سے منصۂ شہود پر

لا سکے اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو یہ دنیا اُس کے سوز اور حرارت کی متحمل کیونکر ہو سکتی ہے؟

پھر گویا انہیں مقاصد کو ایک دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے سے

یک مثال اے دل پئے فرقے بیار
تا بدانی جبر را از اختیار

دست کو لرزاں بود از ارتعاش
وانکہ دستے را تو لرزانی زجاش

ہر دو جنبش آفریدہ حق شناس
لیک نتواں کرد ایں با آں قیاس

زاں پشیمانی کہ لرزانیدیش
مرتعش را کے پشیماں دیدیش

زیں پشیمانی کہ وادی لرزہ اش
چوں پشیماں نیست مردِ مرتعش

بحثِ عقل است ایں چہ عقل آں حیلہ گر
تا ضعیفے رہ برد آں جا مگر

بحث عقلی گر درد مرجاں بود
آں دگر باشد کہ بحثِ جاں بود

بحث جاں اندر مقامے دیگر است
بادۂ جاں را قوامے دیگر است

یعنی اسی طرح جبر اور اختیار کے باہمی فرق کو سمجھنے کے لئے ایک اور مثال پر نظر کرو۔ ایک تو ہے وہ شخص جس کو رعشے کی "بیماری" ہے۔ اور ایک آپ ہیں کہ اپنے ہاتھ کو خود بخود جنبش دیتے ہیں، اب دونوں چیزوں کا خالق اور مختار اگرچہ خدا ہی ہے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں باہمی طور پر کوئی فرق نہیں، یا ان دونوں حالتوں کی ذمہ داری سراسر خدا ہی پر عائد ہوتی ہے؟ تم تو اپنی اس کیفیت پر نادم اور پشیمان بھی ہو گے کہ تم نے ہاتھ کو جان بوجھ کر جنبش دی اور ایک قیمتی شے تمہارے ہاتھ سے گر کر پاش پاش ہو گئی، لیکن اگر یہی فعل ایک لرزاں اور مرتعش انسان سے سرزد ہو، تو اس کو چنداں پشیمانی نہیں ہو گی۔ کیونکہ وہ بیماری کی وجہ سے معذور اور مجبور ہے۔ پس ذی شعور، صاحب ہوش و ادراک اور مختار ہونے کی حالت میں جو غفلت یا کج روی تمہاری طرف سے عمل میں آئے وہی مخلوق کے علاوہ خالق کے غصے کو بھی بھڑکاتی ہے، اور وہی سب سے زیادہ قابلِ مواخذہ بھی ہے، یہ عقلی دلائل تو محض اس لئے پیش کئے جا رہے ہیں کہ کوئی کمزور عقیدے کا انسان ان سے راہِ راست پر آجائے، ورنہ اگر عشق کے اُس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے جس کے سامنے ایسے مسائل خود بخود روشن ہو جایا کرتے ہیں، تو عقل کی وہاں کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ عقل اگر ہمارے سامنے ہیرے اور جواہرات لا کر بکھیر دے تو بھی عشق کے سرمائے کو ہرگز نہیں پہنچ سکتی پھر انہیں مقدمات پر چند اور دلائل پیش کئے جاتے ہیں جن میں خالق اور

مخلوق کی نسبت راز و نیاز اور محبت کی چاشنی بھی موجود ہے، فرماتے ہیں۔

فعلِ حق و فعلِ ما ہر دو بہیں
فعل مارا ہست داں پیداست ایں
گر نباشد فعلِ خلق اندر میاں
پس مگو کس را چرا کردی چناں
خلقِ حق افعالِ ما را موجد ست
فعلِ ما آثارِ خلق ایزد ست
لیک ہست ایں فعلِ ما مختار ما
زو جزا گہ مارِ ما گہ یارِ ما
زانکہ ناطق حرف بیند یا غرض
کے شود یکدم محیطِ دو عرض؟
گر بمعنی رفت شد غافل ز حرف
پیش و پس یکدم نہ بیند ہیچ طرف
آں زماں کہ پیش بینی آں زماں
تو پس خود کے بہ بینی ایں بداں
چوں محیطِ حرف و معنی نیست جاں
چوں بود جاں خالقِ ایں ہر دو آں
حق محیط جملہ آمد اے پسر
وا ندارد کارش از کارِ دگر

گفتِ ایزد جانِ مارا مست کرد
چوں ندا ند آنکہ را خود ہست کرد
گفت شیطاں کہ بمَا اغویتنی
کرد فعل خود نہاں دیوِ دنی
گفتِ آدم کہ ظلمنا انفسنا
او ز فعلِ حق نبد غافل چو ما
در گنُہ او از ادب پنہانش کرد
زاں گنُہ بر خود زدن او بر بخورد
بعدِ توبہ گفتنش اے آدم نہ من
آفریدم در تو آں جرم و محن
نے کہ تقدیر و قضائے من بدآں
چوں بوقتِ عذر کردی آں نہاں
گفت ترسیدم ادب نگذاشتم
گفت من ہم پاسِ آنت داشتم
ہر کہ آرد حُرمت او حُرمت برد
ہر کہ آرد قند لوزینہ خورد
طیّبات از بہر کہ؟ للطیّبین
یار را خوش کن مرنجان و ببیں

یعنی اے دوستو! خالق اور مخلوق کے افعال کا صحیح طور پر

تجزیہ کرو' اس طرح تمہاری تمام مشکلیں حل ہو جائیں گی، تمہیں چاہیئے کہ اپنے افعال کو مخلوق ہونے کی حیثیت سے مخلوق ہی تصور کرو' یہ ایک ایسی بات ہے جسے ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے' اچھا اگر ہمارے افعال اور ارادوں کو زندگی کے کاروبار میں کسی قسم کا دخل نہیں تو پھر قانون اور محاسبے کی کیا ضرورت ہے؟ جیل خانے کیوں بنائے گئے ہیں؟ سزائیں کیوں تجویز کی جاتی ہیں؟ انسان کیوں رات دن مستقل طور پر اس کش مکش میں مبتلا ہیں؟ اس طور پر "جرم" اور "گناہ" کا مفہوم کیا ہوگا؟ اگر ایسا ہے، تو جنت اور دوزخ جو ایک طور پر دنیوی جزا و سزا کا ایک برتر نمونہ ہیں. کہاں جائیں گے؟ یہی تو بات ہے کہ خدا کے اختیارات ہی ہمارے افعال کے موجد ہیں اور یہ افعال حقیقت میں اُسی کی صفات جلالی و جمالی کا مظہر ہیں. جو ہم میں نمایاں ہوتے. اب کہ ہم نے اپنے زاویہ کے اندر تمام افعال کو مخلوق تسلیم کرلیا، تو لازماً ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اُن کی بجا آوری میں ہم ذاتی طور پر سراسر مختار اور آزاد ہیں اور اس بنا پر ہماری مذموم حرکات ہمیں نقصان پہنچاتی ہیں اور اچھے افعال کا نتیجہ ہمارے حق میں ہمیشہ خوشگوار اور مبارک رہتا ہے' اب مخلوق کے ان افعال اور اختیارات کی تحدید اس شخص کی حالت سے کیجئے جو بیک وقت کسی فقرہ کے الفاظ اور معانی یکساں طور پر حاوی نہیں ہو سکتا' اُس کی توجہ اگر الفاظ کی طرف ہوگی تو معانی کا رشتہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور اگر سراسر معانی پر نظر ہوتی، تو

الفاظ کے محاسن کا خاطر خواہ اندازہ نہیں ہو سکے گا، پس یہ خالق ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ بیک وقت صورت اور معانی، عرض اور جوہر، مادہ اور روح، جسم اور جان، ازل اور ابد، جُز اور کل، سب پہ بلا تکلف حاوی ہو سکتا ہے، جس خدا کا حکم "کن" ہمیں وجود میں لایا" وہ ہمارے رگ و ریشہ سے کیونکر غافل اور بے خبر رہ سکتا تھا؟ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ شیطانِ لعین جس کا ارادہ ہی شرارت اور کجروی تھا۔ جب آمادۂ فساد فساد ہوا، تو اس نے اپنی غلطی اور خطا کو سراسر خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ اور اپنے اختیارات کا وہ حصہ بالکل پوشیدہ کر گیا جس میں اُس نے بغاوت اور سرکشی کو دخل دیا تھا۔ بخلاف اس کے جب آدم کا ذکر آیا تو اس نے آداب کو فراموش نہ کرتے ہوئے سہو و خطا کا مرجع سراسر اپنی ذات کو قرار دیا اور ذاتِ باری تعالیٰ کو اس سے بالکل منزّہ رہنے دیا۔ جب اس نے یہ مسلک اختیار کیا اور اس گنہ کا ذمہ دار خود ہی کو ٹھیرایا، تو اُس دلنواز محبوب کو بھی آدم کی یہ سچی فریفتگی اور مستقل وفاداری دل سے بھا گئی اور اُسے اپنا منظورِ نظر اور مقبولِ بارگاہ قرار دیا۔ چنانچہ توبہ قبول کر لینے کے بعد اُس نے آدم سے یہ سوال بھی کیا کہ "اے آدم! کیا تیرا یہ ارتکابِ جرم اور پھر اُس کی نسبت رنجیدہ اور تشویشناک ہونا ہماری طرف سے نہ تھا، اور کیا یہ سب کچھ ہماری مشیت اور ہمارے ارادہ سے عمل میں نہیں آیا؟ پھر تو نے اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہوئے تمام کا تمام بوجھ اپنی گردن پر کیوں ڈال دیا؟"

جواب ملا۔ کہ "اے آقا، یہ سب کچھ محبت اور ادب کے تقاضے سے تھا، پھر میں اس کی خلاف ورزی کو کیونکر جائز سمجھتا؟" کہا کہ "پھر ہم نے تیری اس عقیدت اور جذبۂ اخلاص و وفاداری کی خاطر خواہ قدردانی کی اور تیرے حق کو فوت نہ ہونے دیا۔"

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر چیز کو استعمال میں لانے کا ایک سلیقہ اور ایک صلاحیت ہوا کرتی ہے، اُس سلیقے کے ماتحت اگر ایک غیر مانوس اور قبیح شے کو بھی اچھی صورت میں نمایاں کیا جائے اور اس میں یقین اور وفاداری کو بھی دخل ہو، تو وہی شے باغ ارم کی صورت اختیار کر لے گی۔ اور نتائج نہایت کامیاب رہیں گے[1]۔ چنانچہ "جبر" ہی کو دیکھو کہ ایک شخص اُسے بُری طرح سے استعمال میں لاتا ہے اور اس بنا پر ہمیشہ کے لئے مردود اور لعین سمجھا جاتا ہے، دوسرا اُسی چیز کو اچھے طریق پر استعمال میں لاتا ہے اور مقبولِ بارگاہِ ایزدی ہو جاتا ہے، یہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جو عزت کرے گا وہ عزت کیا جائے گا اور جو بھی شیرینی لائے گا اُس کی ضیافت حلوۂ بادام سے ہوگی۔

---

[1] انیسویں صدی عیسوی کا مشہور انگریزی شاعر لارڈ ٹینی سن اسی نظریہ کی رو سے کہتا ہے۔

O, yet we trust that some how,
every winter shall change to spring,
and good will come out of evil.

اچھے اور پاکیزہ تاثرات کن لوگوں کے لئے ہیں؟ اُن کے لئے جو پاک طینت اور سلیم الفطرت ہیں، بس ہزار باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ اپنے محسن اور محبوب کو کسی نہ کسی طریق پر خوش رکھو اور پھر دیکھو کہ اُس کی فیاضی تمہارے حق میں کیا رنگ لاتی ہے۔

نظیری نے بھی حسن و عشق اور طالب و مطلوب کے اس باہمی راز و نیاز کو تغزل کے طور پر نمایاں کیا ہے، مفہوم اور مقصد تو وہی ہے جو مولانا رومؔ کا تھا، لیکن انداز ملاحظہ ہو ؎

منفعل زر نجش بے جانہ بے نمش
می آرم اعترافِ گناہِ نہ بودہ را

اور حافظؔ کہتا ہے ؎

گناہ اگرچہ نبود اختیارِ ما حافظ
تو در طریق ادب کوش گو گناہِ من است

غالبؔ ؎

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں عمواس کی وبا ایک ایسی بلائے آسمانی تھی کہ تاریخی روایات کے مطابق پچیس ہزار مجاہدین اس کی نذر ہو گئے، مسلمانوں کا ایک جم غفیر چونکہ مذہبی حیثیت سے نہایت خوش عقیدہ واقع ہوا تھا، اور پھر اُن کے سپہ سالار ابو عبیدہؓ تقدیر کے

مسئلہ پر اور بھی شدت سے کاربند تھے، اس لئے جب حضرتِ عمر کی طرف سے انہیں کوچ کرنے کا حکم ملا۔ تو طیش میں آ کر کہا۔ "افرار من قدر اللہ؟ یعنی" اے عمر! تقدیرِ الٰہی سے بھاگتے ہو؟ حضرت عمر نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ کورانہ تقلید سے گذر کر مسئلہ تقدیر کا نہایت صحیح اور مناسب حل ہے، آپ نے کہا۔ "نعم افر من قضاء اللہ الی قضاء اللہ"۔ ہاں میں تقدیرِ الٰہی سے بھاگتا ہوں۔ لیکن میرا یہ بھاگنا بھی تو تقدیرِ الٰہی کی طرف ہے، کیا یہ بھی اُسی خدا کا حکم نہیں کہ تم جان بوجھ کر موت کے منہ میں نہ جاؤ؟"

خودی اور تکبّر میں فرق

اب کہ خودی کی نفسیات پر تفصیل سے بحث کی جا چکی، مجھے اس کے متعلق ایک نہایت ضروری چیز کا ذکر کرنا ہے اور وہ خودی اور تکبر" کا باہمی فرق ہے، آج تک جہاں کہیں بھی مجھے اقبال کی شاعری پر گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے اکثر لوگوں کو اقبال کے فلسفۂ خودی کی نسبت ایک خطرناک غلط فہمی میں مبتلا پایا، اور وہ اس کے انتہائی نتائج کو کبر و غرور اور نخوت پر محمول کرتے ہیں، مجموعی طور پر میں اُن کے تاثرات ذیل کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں، آپ اُن کی ذہنیت کا اندازہ فرمائیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ:۔

"اقبال اپنے کلام میں انسانی اختیارات اور خدائی اختیارات کی مناسب تقسیم نہیں کرتا اور اس لئے تقدیر کا ضابطہ سراسر باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔"

پھر کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"اقبال کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مشیت ایزدی کا مالک انسان ہے اور ایسی حالت میں انسان بذاتِ خود ایک ایسی شخصیت تصور کی جائے گی جو محکوم و مطیع رہنے کی بجائے حاکم اور مختار ہے۔"

اور کسی مہربان کا قول ہے کہ:۔

"اقبال تصوّف کو جوشِ عمل کے منافی سمجھتا ہے، وہ تنویر باطن کی نسبت تسخیر کائنات پر زیادہ دباؤ دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں اقبال کی "خودی" اپنے اندر کبر و غرور کا مفہوم لئے ہوتے ہے۔"

یہ ہے وہ عقیدہ جو بعض لوگ اقبال کی نسبت اپنے دلوں میں پیوست کئے ہوتے ہیں، لیکن میرے نزدیک ایسے غلط نظریات کی بنا دو ہی وجوہات پر ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ایسے حضرات نے اقبال کے کلام کا کبھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہی نہیں یا اگر کچھ مطالعہ کیا بھی ہے تو وہ روحِ معانی کی صحیح دریافت سے قاصر رہے ہیں۔

نبی اکرمؐ نے کسی زمانہ میں اپنے بلیغ اور حکمت آموز الفاظ میں فرمایا

تھا کہ ماھلك امرؤ عرف قدرہٗ یعنی "وہ شخص کبھی تباہ و برباد نہیں ہو سکتا جو کائنات میں اپنی قدر و منزلت کو پہچان لے"۔

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال اپنے فلسفۂ خودی میں ممکناتِ انسانی کی اس حیات افروز تشریح کے علاوہ کوئی دوسری چیز بیان نہیں کرتا، وہ تو صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ ؎

ذمن گو صوفیانِ با صفا را   خدا جویانِ معنی آشنا را
غلامِ ہمتّ آں خود پرستم   کہ با نورِ خودی بیند خدا را

"میری طرف سے خدا دوست صوفیوں کو یہ پیغام پہنچا دو۔ کہ میں اس خود شناس انسان کا غلام ہوں جو خودی کے نور سے ذاتِ خداوندی کا مشاہدہ کرے"۔

پھر جو شخص اپنے پیامِ خودی کی بنا ہی تزکیۂ نفس اور معرفتِ الٰہی پر رکھے، اس کے متعلق کبر و نخوت کا گمان کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ اقبال کا انسان بلاشبہ "خود پرست" ہے لیکن یاد رہے کہ وہ اپنی خود پرستی میں محو ہو کر خدائی اختیارات کو بھول نہیں جاتا، جہاں یہ انسان خودی کا خلاق ہے وہاں اپنے آپ کو تجلیاتِ الٰہی کے ظہور، اور مشاہدۂ ذات کا زینہ بھی بناتا ہے اس طور پر یہ حرم کی تعمیر تو کرتا ہے لیکن بت پرستی کی جانب مائل ہو کر شرکِ عظیم کا مرتکب نہیں ہوتا ؎

خود ح تعمیر کن در پیکرِ خویش
چو ابراہیم معمارِ حرم شو!

میں کہوں گا۔ کہ جب کبھی انسان خودداری اور انانیت کا آوازہ بلند کرے اور اس کا ضمیر اپنے محسن سے باغی بھی نہ ہو، تو اس میں انسان نہیں بولتا، بلکہ فطرتِ الٰہی نعرہ زن ہوتی ہے، اس وقت کا جلال انسان کی کمزور اور غیر مستقل ہستی کا جلال نہیں، بلکہ یہ درحقیقت خدا کی عیرت اور شانِ قہاری ہے، جو اس کے دل اور زبان سے اپنی عظمت کی ترجمانی کرا رہی ہے، اقبال نے غالباً اسی وقت کے لئے کہا تھا کہ

تراشیدم صنم بر صورتِ خویش — بشکلِ خود خدا را نقش بستم
مرا از خود برون رفتن محال است — بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

"میں نے اپنی ہی شکل پر ایک مجسمہ تیار کیا، اور اس کی پرستش میں سراسر مستغرق ہو گیا، سچ پوچھو تو یہ مجسمہ جس کی میں پرستش کرتا ہوں انسانی عوارضات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا، بلکہ یہ درحقیقت خدا کی شانِ جباری کا ظہور ہے، پس ایسی حالت میں مجھے اپنی ذات کے علاوہ کسی اور جانب نظر دوڑانے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر حیثیت اور ہر حالت میں اپنی پرستش سے خدائے واحد کی پرستش ثابت کرتا ہوں۔"

پھر فرماتے ہیں ؎

سخن از بود و نبودِ خود خموشم — اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن این نوائے سادہ کیست — کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

"میں اپنے معدوم یا موجود ہونے کی نسبت خاموش ہوں، یعنی جب کبھی خداوندی کی طرف نظر کرتا ہوں تو مجھے اپنی ہستی کالمعدوم دکھائی دیتی ہے

لیکن جب اس حقیقتِ نفس الامری پر غور کیا جاتا ہے کہ اُس نے مجھے دنیا میں اپنا خلیفہ اور ترجمان بنا کر بھیجا ہے تو پھر مجھ سے زیادہ "موجود" کوئی نہیں، پس میں اپنی برتری اور استقلالِ ذاتی کی تصدیق فقط اسی سے حاصل کرتا ہوں کہ فطرتِ الٰہی کی ایک مبہم اور نامعلوم آواز ہمہ وقت میرے سینہ میں پکار پکار کر کہے دیتی ہے۔ ارض و سما میں "موجودِ حقیقی" تیرے سوائے اور کوئی نہیں، لہٰذا اس برگزیدہ مقام کی حفاظت سے ناموسِ خداوندی کا امانتدار ہو جا۔" ؎

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرورِ سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا خودی غیر کی! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات

(ضربِ کلیم)

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

اس لحاظ سے ہمیں کہنے دو اور غیر ضروری مصلحت اندیشیوں سے بے نیاز ہو کر کہنے دو کہ خودی کا محافظ اپنے اندر کبریائی اور اختیارات کا تمام ممکن سرمایہ لئے ہوئے ہے، ازل اُس کا ہے، ابد اُس کا ہے، اس کی

تقدیر خدا کی تقدیر ہے اور خدا کی تقدیر اُس کی رضا جوئی سے کبھی ابا نہیں کرتی، مشیّت الٰہی ہمیشہ اس کی تائید میں ہے اور وہ خدا کی تمام مصنوعات اور قوّتِ تخلیق کا مرکزِ وحید ہے وہ دوسروں میں حقوق تقسیم کرتا ہے، لیکن خود کبھی اُن کا دستِ نگر یا محتاج نہیں ہوتا، کائنات اس کے گرد چکر لگاتی ہے اور یہ اس کا بہترین اعزاز ہے، بہت سے کور چشم اور کم ظرف انسان تسخیرِ آفاق کو اپنی دانش و ہمت کا انتہائی کارنامہ خیال کئے ہوئے ہیں، مگر خودی کا شناسا وہ محکم اور توانا ہستی ہے جس میں ایسے ایسے سینکڑوں آفاق بذاتِ خود محو ہو جاتے ہیں اور ہنوز اس کی تشنہ لبی کو تسکین حاصل نہیں ہوتی، چنانچہ "ضربِ کلیم" میں ایک جگہ فرمایا ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

مضراتِ خودی

یہاں چند ایسی چیزوں کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جنہیں بظاہر چنداں اہمیت نہیں دی جاتی، لیکن فی الحقیقت وہ خودی کو سخت ضعف پہنچانے والی ہیں۔ اولاً "خوف" کو لیجیے کہ یہ اس سفر میں پہلا رہزن ہے، علامہ موصوف اس کے مضرات کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر — از نبی تعلیم لاتحزن[1] بگیر
ایں سبق صدیق را صدیق کرد — سرخوش[2] از پیمانۂ تحقیق کرد
از رضا مسلم مثالِ کوکب است — در رہِ ہستی تبسم برلب است
گر خدا داری زغم آزاد شو — از خیالِ بیش و کم آزاد شو

---

[1] خوف کو دل میں جگہ نہ دو
[2] سرخوش: مست

قوتِ ایماں حیات افزایدت — وردِ لاخوف علیہم بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود — قلبِ او از لاتخف محکم شود
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است — کاروانِ زندگی را رہزن است
بیمِ جاسوسے است از اقلیمِ مرگ — اندرونش تیرہ مثل سیمِ مرگ
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست — اصلِ او بیم است اگر بینی درست

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

یہ تمام اشعار گویا الا انّ اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون کی تفسیر ہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے نیک اور فرمانبردار بندے خوف وہراس یا غم وحسرت کو اپنے دل میں کبھی جگہ نہیں دیا کرتے اور پھر یہ کس قدر صحیح ہے کہ غیر اللہ کا خوف ہی انسان کو بزدل اور کمزور بناتا ہے یہاں آپ کو تاریخ کا وہ واقعہ پیش نظر لانا چاہیئے۔ جبکہ ایک سفیر کسی خطرناک سازش کے ساتھ حضرت عمرؓ کی طرف آتا ہے، آپ مدینہ منورہ میں نہیں، بلکہ نخلستان میں ایک کھجور کے نیچے بے خوف اور بے تکلف سوئے پڑے ہیں، نہ قالین ہیں اور نہ گاؤ تکیے، کنکروں کا بچھونا ہے اور ہاتھ کا قدرتی سرہانا۔ سفیر جب انہیں تلاش کرتا ہوا اس جگہ پہنچتا ہے، تو اس کیفیت کو دیکھ کر نہ صرف متعجب ہوتا ہے بلکہ خوف وہیبت سے اس کا جسم بھی تھرتھرانے لگتا ہے اور نتیجہ کے طور پر اس کی زبان بے اختیار گواہی دیتی ہے کہ ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید
ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

مولانا روم نے اپنے یہاں اس واقعہ کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اور اس ضمن میں اس متحیر اور خوف زدہ سفیر کے باطنی تاثرات بھی مکمل طور پر دکھلاتے ہیں، چنانچہ ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ ہو سکے گا ؎

دید اعرابی زنے او را خسیل — گفت عمر نک بزیر آں نخیل
زیر خرما من ز خلقاں او جدا — زیر سایہ خفتہ بیں سایہ خدا
آمد آنجا و از دور ایستاد — مر عمر را دید و در لرزہ فتاد
ہیبتے زاں خفتہ آمد بر رسول — حالتے خوش کرد بر جانش نزول
مہر و ہیبت ہست ضد یکدگر — ایں دو ضد را دید جمع اندر جگر
گفت با خود من شہاں را دیدہ ام — پیش سلطاناں خوش و گزیدہ ام
از شہانم ہیبت و ترسے نہ بود — ہیبت ایں مرد ہوشم در ربود
رفتہ ام در بیشۂ شیر و پلنگ — روئے من زیشاں نگردانید رنگ
بس شدستم در مصاف و کارزار — ہمچو شیر آندم کہ باشد کارزار
بس کہ خوردم بس زدم زخم گراں — دل قوی تر بودہ ام از دیگراں
بے سلاح ایں مرد خفتہ بر زمیں — من بہفت اندام لرزاں چیست ایں
ہیبت حق است ایں از خلق نیست — ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست
ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید — ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

لہ ہتھیار ؎ گودڑی

اندریں فکرت بحرمت دست لبست | بعد یک ساعت عمر از جائے جست
کرد خدمت مر عمر را و سلام | گفت پیغمبر سلام آنگہ کلام
پس علیکش گفت و اوراپیش خواند | ایمنش کرد و بنزد خود نشاند
ہر کہ ترسد مر ورا ایمن کنند | مر دل ترسندہ را ساکن کنند
لاتخافوا ہست نزل خائفاں | ہست در خور از برائے خائف آں
آنکہ خوفش نیست چوں گوئی مترس | درس چہ خواہی نیست او محتاج درس

خاطرِ ویرانش را آباد کرد

آں دل از جا رفتہ را دل شاد کرد

(۳) اس کے بعد جو چیز عزتِ نفس اور خودی کو برباد کرنے والی ہے وہ نسب پرستی ہے، جو لوگ محض "پدرم سلطان بود" ہی کی رٹ لگانا جانتے ہیں وہ دنیا میں کسی طرح کی ترقی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں ؎

ہر نسب نازاں شدن نادانی است

حکمِ او اندر تن و تن فانی ست

یعنی یہ حسب نسب کا فخر بھی جسم ہی کے ساتھ فنا ہو کر رہ جائے گا لہٰذا اگر تم حقیقی ترقی کے خواہاں ہو، تو روحانی قوتوں کو فروغ دو، ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

عشق در جان و نسب در پیکر است

رشتۂ عشق از نسبِ محکم تر است

جامی کا ایک شعر ہے ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

پس معلوم ہوا کہ عزت کا صحیح معیار تقویٰ اور حسنِ عمل کے سوا اور کچھ نہیں، یہی وجہ ہے کہ ؎

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

عہدِ صحابہ میں سلمان رضؓ سے جب کوئی آپ کے حسب و نسب کی نسبت دریافت کرتا تو آپ جواب میں فرماتے "سلمان ابن اسلام"۔

نسب اگر عملی حیثیت سے کوئی مفید چیز ہوتی تو نوح علیہ السلام کا بیٹا اس عبرتناک طور پر کبھی طوفان کی نذر نہ ہوتا۔

(۳) اس کے بعد سوال بھی خودی کے لئے بہت مضر چیز ہے۔ اس سے بھی قوائے نفسیہ کو سخت صدمہ پہنچتا ہے اور انسان اپنے نزدیک بھی اپنا وقار کھو بیٹھتا ہے۔ نبی کریمؐ نے نہایت بلیغ الفاظ میں نعمت کی فضیلت اور سوال کی مذمت ظاہر فرمائی ہے اور سچ پوچھو تو انہیں دو جملوں میں احساسِ خودی کو انتہائی کمال تک پہنچا دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ الید العلیٰ خیرٌ من الید السفلیٰ یعنی اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہت اچھا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب بھی فرماتے ہیں ؎

ناتوانی کیمیا شو گل مشو   در جہاں منعم شو و سائل مشو

اسی غیرت کو کام میں لاتے ہوئے دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

"اسرارِ خودی" کے دیباچہ میں ڈاکٹر صاحب نے لفظِ "سوال" کی مزید توضیح فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

جس طرح عشق سے خودی میں پختگی اور توانائی آتی ہے، اسی طرح سوال سے اس میں ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات تمہیں بغیر ذاتی کوشش کے حاصل ہو جائے وہ سوال کے ذیل میں آجاتی ہے، ایک دولت مند کا بیٹا جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد اُس کی جائداد کا وارث ہوتا ہے، دراصل سائل یعنی گدا ہے، اسی طرح جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدارِ فکر بناتا ہے، وہ بھی سائل ہے پس خودی کو پختہ کرنے کے لئے ہمیں عشق اختیار کرنا چاہیئے۔ یعنی اپنے اندر قوتِ انجذاب پیدا کرنی چاہیئے اور ہر قسم کے سوال سے محترز رہنا چاہیئے ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احسان اُٹھائیے

حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ ہر کام خود کیا کرتے اور کسی سے سوال

ہرگز گوارا نہ فرماتے۔ حتیٰ کہ اونٹ پر سوار ہونے کی حالت میں ہاتھ سے کوڑا بھی گر جاتا، تو خود ہی اتر کر اٹھا لیا کرتے تھے۔

(۴) تقلید بھی انسانی فطرت کے ممکنات کو مضمحل اور کمزور کر دینے والی چیز ہے۔ زندگی میں انسان کی فضیلت اور برتری کا سب سے بڑا معیار تحقیق اور اجتہاد ہے۔ لیکن تقلید اِن فضائل سے انسان کو محروم رکھتی ہے، چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پے | زبندِ پاستانؑ آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب | پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

یعنی تقلید اگر کوئی اچھی شے ہوتی۔ تو نبی کریمؐ سب سے زیادہ اس کے حقدار تھے، تقلید میں انسان ذاتی طور پر بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے، اس لئے لازماً قوتِ ارادی کو بھی کھو بیٹھتا ہے اور یہ حالت عین اس میت کی سی ہے، جو کسی غسال کے ہاتھ میں دے دی گئی ہو اور حق تو یہ ہے کہ ایسی کیفیت انسانی شرف کے سراسر خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ موصوف دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ پر زور الفاظ میں فرماتے ہیں ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈھ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اور "ضربِ کلیم" میں "اجتہاد" کی تلقین اور تقلید کی مذمت اس طور پر فرمائی ہے ؎

ؑ پرانی داستانیں

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اُس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اِس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصوّر میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

پھر تقلید سے محترز رہتے ہوئے "تخلیق" کی شان ملاحظہ ہو ۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کئے بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا
ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہمعناں پیدا

(۵) ہمارے نزدیک کسی دنیوی ہستی کے ساتھ ایسی محبت کرنا، جو پرستش اور خود فراموشی کی حد تک پہنچ جائے، بھی احساسِ خودی کو فنا کر دینے کے لئے بالکل کافی ہے، بعض لوگ یہاں کہہ دیں گے کہ صاحبِ حسن کو خدا نے جلوہ ریزی کے لئے پیدا کیا ہے، ہر چیز اُسے فطری طور پر چاہتی ہے، پھر انسان کا دل اُس کی جانب کیوں مائل نہ ہو اور عشق اُس سے اپنی غذا حاصل کرنے میں کیوں کوتاہی کرے؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ بجا، نہ ہی آپ اس کے بغیر جی سکتے ہیں، اور نہ ہمیں آپ کو مجبور کرنا چاہیئے لیکن پھر بھی ایسی والہانہ پرستش سے مجتنب رہنا چاہیئے جو محبوب کو ایک طور پہ خدا بنا دے اور عاشق کی طرف سے بے چارگی اور ذلت کا اظہار ہو، اور اگر انسان میں ایسا ہی شوق پرستش موجود ہے، تو خدا نے اس کی وجوہات ہماری اپنی ذات میں شاید سب سے زیادہ رکھی ہیں ؎

حسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

اور ؎

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں!
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ یہاں معشوقوں کی نظر فریبی سے انکار کیا جا رہا ہے کیوں کہ ؎

چھپایا حُسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

لیکن ہم کہتے ہیں کہ اپنے جذبۂ شوق کو کسی ایک شخص سے وابستہ اور مقید کر لینا بھی کہیں کی عقلمندی نہیں کیونکہ اس طرح سے جہاں ایک طرف خودی کو صدمہ پہنچتا ہے، تو دوسری جانب خدا کی ناشکری بھی لازم آتی ہے، آپ شاید پھر سوال پیدا کریں کہ ہم تو حسن سے "چمٹ" کر بھی صنعتِ خداوندی کی داد دیتے ہیں، پھر یہ ناشکری کیونکر ہوئی؟ مگر ہمارے نزدیک ناشکری یوں ہوئی کہ وہ آپ کو سمندر دینا چاہتا ہے، آپ صرف ایک قطرہ پر قناعت کر لیتے ہیں، وہ آپ کو آفتاب سپرد کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور آپ کا ہاتھ کسی معمولی ستارے پر ہے وہ آپ کو اس ضمن میں "گلہائے رنگ رنگ" سے محظوظ کرنا چاہتا ہے اور آپ فقط ایک پھول ہاتھ میں لے کر محو ہو گئے ہیں، وہ آپ کو اذیت نہیں پہنچانا چاہتا اور عزتِ نفس کا محافظ ہے، آپ جان بوجھ کر یہ تکلیفیں خود پیدا کر لیتے ہیں اسی لئے مجھے شاعر کے یہ الفاظ بہت پسند آئے ہیں، وہ کہتا ہے:۔

Give beauty all her right,
She is not to one form tied;
Each shape yields fair delight,
Where her perfections bide.

یعنی حسن کو اس کا مکمل حق تفویض کر دو، اس لئے کہ وہ کسی ایک جسم یا کسی ایک صورت سے مقید نہیں کر دیا گیا، خدا نے اُسے جہاں اور جس سانچے میں بھی ڈھالا ہے، وہاں اُس کی لچک اور دلربائی، شعریت اور نزاکت، رنگینی اور تڑپ، شوخی اور جاذبیت کو ہر لحاظ سے بجائے خود مکمل اور مختلف رہنے دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی وفا کیش اور کوتاہ نظر عاشق نے جب "شاعر" کے وسیع اور بے پایاں عشق کو دیکھا، تو اُسے خود اختیاری اور مسرت کی بجائے "ہرجائی پن" پر محمول کرتے ہوئے ازراہ تشنیع بولا ؎

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے
تیرے ہنگاموں سے اے دیوانۂ رنگیں نوا
زینتِ گلشن بھی ہے آرائشِ صحرا بھی ہے
ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعتِ پرواز میں
اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے
عین شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
مثلِ بوئے گل لباسِ رنگ سے عریاں ہے تو
ہے تو حکمت آفریں لیکن تجھے سودا بھی ہے
جانبِ منزل رواں بے نقشِ پا مانندِ موج
اور پھر افتادہ مثلِ ساحلِ دریا بھی ہے

حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لئے
پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے
تیری ہستی کا ہے آئینِ تفنن[1] پر مدار
تو کبھی ایک آستانے پر جبیں فرسا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا ناآشنا تیرا خطاب
اے تلوّن کیش! تو مشہور بھی رسوا بھی ہے
لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بیتابی کے صدقے ہے عجب بیتاب تو

شاعر اس پر کہتا ہے کہ میری طبیعت حسن وجمال کی شیدائی تو ہے لیکن میں اس شوق میں کسی انفرادی جھلک سے بے نیاز رہتے ہوئے "تنوع" کو ہر لحاظ سے ترجیح دیتا ہوں۔ چنانچہ معترض کو جواب ملتا ہے ؎

عشق کی آشفتگی[2] نے کر دیا صحرا جسے
مشتِ[3] خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
ہیں ہزاروں اس کے پہلو رنگ ہر پہلو کا اور
سینے میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھتا ہوں میں
دل نہیں شاعر کا ہے کیفیتوں کی رستخیز[4]
کیا خبر تجھ کو درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں

---

[1] ہنسی مذاق [2] آشفتگی بمعنی وسعت و پریشانی [3] مراد دل [4] قیامت

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
مضطر ہوں، دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حُسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز
سوز و سازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں

موجبِ تسکیں تماشائے شرارِ جستہ
ہو نہیں سکتا کہ دل برق آشنا رکھتا ہوں میں

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ! وہ کامل تجلّی مدعا رکھتا ہوں میں

جستجو کُل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حُسن بے پایاں ہے دردِ لادوا رکھتا ہوں میں

زندگی الفت کی دردانجامیوں سے ہے مری
عشق کو آزادِ دستورِ وفا رکھتا ہوں میں

سچ اگر پوچھے تو افلاسِ تخیل ہے وفا
دل میں ہر دم اک نیا محشر بپا رکھتا ہوں میں

فیضِ ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیرِ پا[1] رکھتا ہوں میں

---

[1] آتش زیرِپا، مضطرب، بے چین ؎
بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِپا ❊ موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

تجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گلا رکھتا ہوں میں
محفلِ ہستی میں جب اتنا تنک جلوہ تھا حسن
پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں
در بیابانِ طلب پیوستہ می کوشیم ما
موجِ بحریم و شکستِ خویش بر دوشیم ما

(۶) غلامی بھی احساسِ خودی کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ یہی ایک چیز ہے جس سے تمام کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ خوف ہو یا نسب پرستی سوال ہو یا تقلید، غرضکہ ہر قسم کی اخلاقی اور عملی خرابیاں غلامی ہی سے نشو و نما پاتی ہیں۔ غلامی تمام عیوب کا گنجینہ ہے!

خودی ایک ہرا بھرا درخت ہے، ایک شجرۂ طیبہ ہے کہ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء۔ غلامی کے علاوہ جتنے عیوب بھی ہیں، ان کی قطع و برید اس درخت کی شاخوں تک محدود ہے لیکن غلامی ہی ایک ایسی چیز ہے جو اس درخت کو جڑ سے اکھیڑ پھینکتی ہے، جس کے بعد اس کے پھلنے پھولنے کی کوئی توقع نہیں رہتی، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس کو ایسی بدتر صورت میں ظاہر فرماتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے ؎

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

خودی کا صحیح احساس غلامی میں فنا ہو کر رہ جاتا ہے اور آزادی میں اس کی کوئی حد نہیں اسے

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

ضبطِ نفس

خودی کا استحکام ضبطِ نفس سے ہے، خودی اس وقت تک بجائے خود کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ جب تک نفس کو قابو میں نہ لایا جائے یہ اکثر دفعہ جوانی کے عالم میں ہاتھ سے نکل جایا کرتا ہے، محبت کا جذبہ جب حد سے زیادہ ستانے لگتا ہے، تو انسان اکثر اوقات اس نورانی چشمے کو ہوس کے زہرآب سے تاریک اور مہلک بنا دیا کرتا ہے۔ نفس اگرچہ ہمیشہ عیش و عشرت کا خواہاں ہے لیکن عمل اور کوشش میں کچھ اور ہی مزا ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف "جاوید نامہ" میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

چشمِ مخمور و نگاہِ غلط انداز و سرود
ہمہ خوب است ولے خوشتر ازاں چیزے ہست
حسنِ رخسار دمے ہست و دمے دیگر نیست
حسنِ کردار و خیالاتِ خوشاں چیزے ہست

اور پھر اسی کتاب میں نوجوانوں کو مخاطب فرماتے ہوتے لکھتے ہیں۔

حفظِ جاں ہا ذکر و فکر بے حساب
حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب
حاکمی در عالمِ بالا و پست
جز بحفظِ جان و تن ناید بدست

علاوہ ازیں ضبطِ نفس کے متعلق جو اصولی نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ بھی حرزِ جان بنانے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں　　می شود فرماں پذیر از دیگراں

اس قانون کو نٹشے نے اپنے فلسفیانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

"جہاں بھی میں نے زندہ اشیا کو دیکھا، وہیں مجھے "اطاعت کیشی" اور "فرمانبرداری" کے کلمات بھی سنائی دیئے، تمام زندہ چیزوں کا لازمۂ حیات ہی یہ ہے کہ وہ اطاعت کرتی ہیں! بعد ازاں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مخلوقات کا تمام وہ حصہ ہمیشہ دوسروں کا مغلوب اور محکوم بن کر زندگی بسر کرتا ہے، جو اپنے ضمیر اور اپنی مصلحت کے زیر اثر اور زیر فرمان رہنا گوارا نہیں کرتا۔[1]

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں　　می شود فرماں پذیر از دیگراں

اور پھر یہ کہ اس لائحہ عمل سے خود کو قوت اور غلبہ کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ اس کی تحقیق اور تلقین ایک دوسرے مقام پر اس پیرایہ میں کی ہے۔

"جہاں کہیں میں نے کسی ذی حیات کو دیکھا، وہیں قوت اور

---

[1] خطباتِ زرتشت عنوان "ضبطِ نفس"

استحکام کی خواہش بھی پائی گئی۔ حتیٰ کہ اس قانون کی برکت سے میں نے غلاموں کو بھی بادشاہت کی آرزو کرتے دیکھا۔

اسی طرح جہاں بھی تم قربانی، خدمت گذاری اور محبت کا جلوہ دیکھو گے وہیں لازمی طور پر تمہیں حاکم اور مختار بننے کا شوق بھی دکھائی دے گا۔

کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ کمزور اور ناتواں ہستیاں ہمیشہ اپنے سے فائق اور برتر لوگوں پر غلبہ اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے پوشیدہ اور نامعلوم طور پر سعی کرتی رہتی ہیں، وہ گویا اندر ہی اندر اپنا قلعہ تعمیر کرتی ہیں اور اس طرح سے جب انہیں دوسروں کے "دل" تک رسائی پانے کی مہلت مل جاتی ہے، تو وہ یک لخت اُسے اپنے پنجۂ آہنین میں دبوچ لیتی ہیں، اب اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور یہ اپنی قوت اور اقتدار کو مناسب وقت پر سنبھال لیتی ہیں۔[1]

یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر ضبطِ نفس کی عمدہ مثال یہاں اور کون پیش کرے گا۔ اور اس پر خدا کی طرف سے جو عزت اور جو مرتبہ آپ کو ملا وہ ان بیانات کا ایک زندہ ثبوت ہے ؎

در خودی کن صورتِ یوسف مقام
از اسیری تا شہنشاہی خرام

"بالِ جبریل" میں مریدِ ہندی پیر رومی سے سوال کرتا ہے ؎

کس طرح قابو میں آتے آب و گل
کس طرح بیدار ہو سینے میں دل

---

[1] خطبات زرتشت عنوان "ضبطِ نفس"

پیر رومی کا جواب ضبطِ نفس اور حفظِ جان کی بہترین تعلیم ہے ؎

بندہ باش و بر زمین رو چوں سمند
چوں جنازہ نے کہ بر گردن برند

عشق اور عقل

خودی کی تخلیق، عشق سے ہے، عشق کے بغیر خودی میں زندگی کی کوئی علامت نمایاں نہیں ہو سکتی، خودی کو ایک جسم تصور کیجئے تو عشق اس جسم کے لئے بمنزلہ روح کے ہو گا، عشق کے بغیر خودی یعقوبؑ کا وہ بیت الحزن ہے جس میں وہ اپنے یوسفِ گم گشتہ کے فراق میں تڑپ رہا ہو۔ پس غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ عشق اور خودی دونوں ایک ہی مادر زاد ہیں اور ان میں تفریق کی چنداں گنجائش نہیں، لیکن قبل ازیں کہ ہم عشق اور عقل کا آپس میں موازنہ کریں یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ جس عشق سے خودی فروغ پاتی ہے، اس کی تعریف کیا ہے، اس کا اثر کتنا ہے اور وہ اپنے اندر کس قدر وسعت رکھتا ہے؟ پس اس کے لئے ایک مستقل بیان کی ضرورت ہو گی۔ اس لئے ہم ذیل میں ابتداً اس حقیقت کو روشن کئے دیتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ اجزائے عالم کی تخلیق سراسر عشق ہی سے ہے، عشق اگر نہ ہوتا، تو دنیا بھی پیدا نہ ہوتی، مینائے عالم میں یہ عشق ہی کا کیف ہے کہ ہر طرف جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے، عشق ہی کا جلوہ تھا کہ جس نے دنیا

کے ذرے ذرے کو سرشارِ محبت بنا رکھا ہے۔ یہ ہر چیز کے اندر اس کی جسامت اور حوصلے کے مطابق خون کی طرح دورہ کرتا اور برق کی مثل زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے، یہ عشق ہی کا واحد رشتہ ہے، جس میں کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز آبدار موتیوں کی مانند روشن نظر آتی ہے، فطرت کے اس احاطۂ عمل سے کوئی ذی حیات بھی قدم باہر نہیں رکھ سکتا، اور اگر رکھے تو یہ اُس کے لئے تباہی اور موت کا پیغام ہے، محبت کی یہی وحدت اور عشق کا یہی توازن ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّہ کا دل چیریں

اسی باطنی تعلق کا ذکر فرماتے ہوئے ایک اور جگہ لکھتے ہیں ؎

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

اللہ! اللہ! محبت کی وحدت کا ذکر اس سے زیادہ مؤثر پیرائے میں اور کون کرے گا۔ اشیا کی منفرد حیثیت یہاں مٹ جاتی ہے اور عشق کی ہیئت اجتماعی کا ظہور ہوتا ہے، جز فنا ہوتا ہے، لیکن اس کا یہ فنا ہونا درحقیقت "کل" میں انجذابِ کامل پیدا کرنے کے لئے ہے، چنانچہ ؎

صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر
اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

اور یہ تعلق کچھ ایسا تعلق ہے کہ اس کی بجا آوری کے لئے ہر چیز فطری طور پر مجبور ہے، ایک اور جگہ عشق کے اسی مفہوم کی ترجمانی فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

شیشۂ دہر میں مانندِ مےِ ناب ہے عشق
روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق

دلِ ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

عشق کی بھی عالمگیر موسیقی ہے جو ان ظاہری کانوں سے سنائی تو نہیں دیتی، لیکن اس کا اثر محبت کی خاموشی میں ڈوب گیا ہے، وجدان کے مبہم اور لطیف احساس میں جذب ہو گیا ہے، فرماتے ہیں ؎

یہ سرودِ قمری و بلبل فریبِ گوش ہے
باطنِ ہنگامہ آبادِ چمن خاموش ہے

اور چونکہ دل بھی عشق ہی کی خاموشی میں ڈوبا ہوا ایک محشرستان ہے، اس لئے فرماتے ہیں ؎

آہ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں
پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

غالبؔ نے بھی عشق کے اسی مفہوم کو لے کر ایک جگہ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ ؎

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

خود مؤلف کے نزدیک جو شعریت، جو لطافت اور جو کیف ایک مبہم اور خاموش موسیقی میں پایا جا سکتا ہے، وہ ہنگامہ آرائی اور شور و شیون میں کبھی ممکن ہی نہیں، ستاروں کا تبسم خاموش ہے، محبوب کی چشمِ نیم باز اپنے اندر فتنوں کا بے انداز سامان لئے ہوئے بھی خاموش ہے۔ اُس کا شعلۂ آواز آتش فشانی کا اس قدر ذخیرہ لئے ہوئے خاموش ہے۔ دریا کا خرام اپنی تہ میں طوفان و تباہی کا اس قدر ہولناک موج لئے ہوئے خاموش ہے، کسی عاشقِ جانباز کے درد بھرے دل سے پیدا ہونے والے نالے سرتاپا خاموش ہیں، ہوا کا خرام اور نکہت کا قافلہ اس رعنائی اور ناز کے باوجود جھنکار پیدا کرنے سے خاموش ہے، غنچہ چٹکتا ہے، عدم سے عالم ہست و بود میں قدم رکھتا ہے، یہاں کے عجائبات دیکھتا ہے لیکن اس پر بھی اس کی مہرِ دہاں نہیں ٹوٹتی اور خاموش ہے، جبریل کی پرواز خاموش ہے، وحی اور الہام ایک نہایت مرتعش چیز ہے اور فضا کو اس کے مقدس نغموں سے ہر طرف گونج اٹھنا چاہیئے لیکن خاموش ہے۔ انتہا یہ ہے کہ فطرت کا تمام نظام خاموش ہے!

اس میں بھی شک نہیں کہ اس خاموش موسیقی کو سننے اور سمجھنے کے لئے "گوشِ حقیقت نیوش" ہونا چاہیئے۔ طبیعت میں رقت ہونی چاہیئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک شاعرِ فطرت کا سا قلب و دماغ ہونا چاہیئے۔ اس حقیقت کو اگر ظاہر اطوار پر بھی جانچنا چاہیں، تو ساز سے اٹھتی ہوئی وہ مدھم اور محزون صدائیں کتنی موثر اور دل دوز معلوم ہوتی ہیں جنہیں ہم

کمالِ توجہ سے سنیں یا مغنیؔ کے وہ سریلے نغمے ہمیں کس قدر جذب کرتے ہیں، جنہیں شاید ہوا کی لہریں بھی بمشکل سن سکتی ہوں، پھر "محبت" کی موسیقی کو تو اس سے بھی زیادہ رقّت انگیز اور اس سے بھی زیادہ خاموش ہونا چاہیئے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے حکما خاموش اور وجدان کو اظہار اور ہنگامہ پروری پر ہمیشہ سے ترجیح دیتے چلے آئے ہیں یورپ نے خاموش فلموں کو متکلم بنانے کے لئے مشین تو ایجاد کی لیکن اہلِ راز اب بھی نوحہ زن ہیں۔ کہ اس سے حقیقت اور صداقت رخصت ہوئے، اداکاری کا جوہر، جو کبھی صرف نظروں ہی نظروں میں نمایاں ہوا کرتا تھا، برباد ہو گیا، وجدان کی خوبیاں جاتی رہیں اور تصنع نے دخل پایا۔

کیٹس کے الفاظ میں بھی نامعلوم اور خاموش موسیقی "فرشتوں کی زبان" ہے۔ شیلے اسی کی نسبت کہتا ہے کہ تمام دوسری آوازیں ہمارے ذہن سے محو ہو جا سکتی ہیں، لیکن موسیقی کبھی محو نہیں ہوتی۔ رومی کی "نے" نیستان سے بچھڑ جانے پر جو نالہ و فریاد کرتی ہے۔ اس کا مطلب بھی یقیناً سوائے اس کے اور کچھ نہیں، اور ورڈس ورتھ جو ایک بے حس اور مردہ سیپی میں سمندر کی نسبت ہجر و فراق کے دردناک نغمے سنتا ہے۔ اس کی تاویل بھی اس والہانہ مقصد کے علاوہ اور کوئی نہیں کی جا سکتی!

پھر عشق کا فیض جتنا عام ہے۔ اس کا اندازہ "پیامِ مشرق" کی مندرجہ ذیل رباعی سے ہو سکتا ہے ؎

بیا غانٍ باد فروردیں دہد عشق[1]
بہ راغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق[2]
شعاعِ مہرِ او قلزم شگاف است
بماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

اور پھر اس کا اثر جس قدر وسیع ہے، اس کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں ؎

بہ برگِ لالہ رنگ آمیزیٔ عشق
بجانِ ما بلا انگیزیٔ عشق
اگر ایں خاکداں را واشگافی
درونش بنگری خونریزیٔ عشق

اس کے بعد بالکل نرالے انداز میں عشق کی بقا اور زندگی کے دوام کا نقشہ پیش کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے ؎

اگر دریں حیات از من بگیری	ترا یک نکتۂ سربستہ گویم
وگر جانے بہ تن داری نہ میری	بمیری گر بہ تن جانے نہ داری

دوسرے شعر کا یہ مطلب ہے کہ اگر تیرا دل سوزِ عشق سے محروم ہے تو مرنے کے بعد بھول کر بھی تجھے کوئی یاد نہیں کرے گا اور اگر واقعی تو عشق سے فیضیاب ہو چکا ہے، تو تجھے ایک ایسی غیر فانی زندگی حاصل ہو گی، جس کے لئے کوئی انتہا نہیں۔

---

[1] موسم بہار کی ہوا [2] جنگل۔ بیابان

حافظ کا یہ شعر اس مفہوم کو اور بھی واضح کئے دیتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

پھر ڈاکٹر صاحب ابنائے زماں کی اس بے حسی اور جمود کو دیکھ کر عشق کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے اس کو دعوت دیتے ہیں ؎

بیا اے عشق اے رمزِ دلِ ما   بیا اے کشتِ ما اے حاصلِ ما
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں   دگر آدم بنا کن از گلِ ما

پھر عشق کی طاقت اور قوتِ تسخیر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ؎

تیشہ[1] اگر بسنگ زد ایں چہ مقام گفتگو است
عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

اور پھر عشق ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی خاطر جان تک قربان کر دینے سے بھی دریغ نہیں ہونا چاہیئے ؎

عشق اگر فرمان دہد از جان شیریں ہم گذر
عشق محبوب است و مقصود است جان مقصود نے

الغرض نتیجہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ ؎

ز رسم و راہِ شریعت نہ کردہ ام تحقیق
جز اینکہ منکرِ عشق است کافر و زندیق

لیکن اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ اس عشق کو ہوس سے دور کا لگاؤ

---

[1] فرہاد کے مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے۔

بھی نہیں اور یہ جذبہ ایک خالص فطری جذبہ ہے، چنانچہ لفظِ عاشق کی صحیح اور حقیقی تعریف کرتے ہوئے علامہ موصوف "زبورِ عجم" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

عاشق آن نیست کہ لب گرمِ فغانے دارد
عاشق آن است کہ بر کف دو جہانے دارد
عاشق آن است کہ تعمیر کند عالمِ خویش
ورنہ سازد بہ جہانے کہ کرانے دارد

عشق کی حقیقت خوب اچھی طرح سے واضح کی جا چکی اور اس کی وسعت، طاقت اور اثر کا مشاہدہ بھی آپ نے فرما لیا، اب اس کے مقابل "عقل" کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں ؎

خرد زنجیریِ امروز و دوش است
پرستارِ بتانِ چشم و گوش است
صنم در آستیں پوشیدہ دارد
برہمن زادۂ زنار پوش است

تو گویا عشق اگر انسان کو ایمان و یقین کی تعلیم دیتا ہے، تو عقل کفر اور شکوک و شبہات میں لا ڈالتی ہے، پس اس پر فیصلہ یہ صادر ہوتا ہے کہ ؎

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

اب یہاں چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن سے عشق اور عقل کا بخوبی موازنہ ہو سکے گا تاکہ ناظرین پر ان دونوں کی خصوصیات اور آپس کا

وہ اعتباری فرق روشن ہو جائے، جیسے ڈاکٹر صاحب بیان کرنا چاہتے ہیں۔ "پیامِ مشرق" کی ایک رباعی ہے ؎

نہی از بادۂ وہو میخانہ بودے　　　گلِ ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق و این ہنگامۂ عشق　　　اگر دل چون خرد فرزانہ بودے

فرماتے ہیں کہ اگر دل بھی عقل کی طرح مصلحت اندیش اور کوتاہ بین ہوتا، تو یہ دنیا بالکل بے رونق ہو جاتی اور زندگی کا کوئی لطف نہ رہتا۔

نظیری بھی شاید اسی مقصد کے زیرِ اثر کہتا ہے ؎

بے عشق عقل راہبرے در دماغ نیست
بد سوزد آں فتیلہ کہ از شعلہ داغ نیست

اور اس لئے ؎

بحکمِ عقل عمل در طریقِ عشق مکن
کہ راہ دور کند راہبرے کہ دانا نیست

اسی طرح دوسری جگہ بھی ڈاکٹر صاحب عشق کی فضیلت اور عقل کی خامی کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

سفالم[1] را مئے او جامِ جم کرد　　　درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بت خانہ ریخت　　　خلیلِ عشقِ دیرم را حرم کرد

"بالِ جبریل" کے یہ اشعار بھی گویا اسی مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں ؎

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشقِ تمام مصطفٰے عقل تمام بولہب

---

[1] سفال۔ مٹی

گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد

عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اس کے علاوہ "جاوید نامہ" میں بھی عشق اور عقل کے باہمی توازن کو بہت اچھی طرح سے واضح کیا گیا ہے، اولاً مطلق عقل کی حالت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست — لیکن از جراتِ رندانہ نیست
پس ز ترسِ راہ چوں کورے رود — نرم نرمک صورتِ مورے رود
تا خرد پیچیدہ تر بر رنگ و بوست[۱] — می رود آہستہ اندر راہِ دوست
کارش از تدریج می یابد نظام — من ندانم کے شود کارش تمام

پھر عشق اور عقل دونوں کا موازنہ کیا ہے ؎

می نداند عشق سال و ماہ را — دیر و زود و نزد و دور راہ را
عقل در کوہے شگافے می کند — یا بگردِ او طوافے می کند
کوہ پیشِ عشق چوں کاہے بود — دل سریع السیر[۲] چوں ماہے بود

اس کے بعد پھر عشق کے کمالات کا ذکر ہے ؎

۱؎ رنگ و بو: عالم اسباب ۲؎ تیز رفتار۔ سبک رو

عشق شبخونے زدن بر لامکاں | گور را نادیدہ رفتن از جہاں
زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست | قوتش از سختیٔ اعصاب نیست
عشق با نانِ جویں خیبر کشاد | عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد
کلۂ نمرود بے ضربے شکست | لشکرِ فرعون بے حربے شکست
عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر | ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در
عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است | کارِ او از دین و دانش برتر است
عشق سلطان است و برہانِ مبیں | ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں
لازمان و دوش و فردائے ازو | لامکان و زیر و بالائے ازو
چوں خودی را از خدا طالب شود | جملہ عالم مرکب و راکب شود
آشکارا تر مقامِ دل ازو | جذبِ ایں دیرِ کہن باطل ازو

عاشقاں خود را بیزداں می دہند
عقلِ تاویلی بقرباں می دہند

اس بیان کے مطابق زندگی کی شاہراہ میں عقل کی رفتار نہایت دھیمی ہے۔ گویا۔ ع

لہ معجزۂ شق القمر کی طرف اشارہ ہے۔

ٹہ یعنی عشق کا کمال جب خودی کی تحقیق میں ڈوبنے لگتا ہے تو کائنات کے تمام اجزا درہم برہم ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس کے زور و قوت کے سامنے ہر چیز متزلزل نظر آتی ہے۔ مرکب گھوڑا۔ راکب۔ سوار۔

سُست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

لیکن عشق اس کے مقابلے میں نہایت جری اور برق رفتار واقع ہوا ہے، عقل بے چاری ممکن اور ناممکن کی بحث میں رہتی ہے اور عشق ایک ہی جست میں سب کچھ کر گزرتا ہے، تاہم عقل کی بھی اگر صحیح طور پر تربیت کی جائے، تو یہ کافی حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے، چنانچہ ؎

عقل ہم عشق است واز ذوقِ نگہ بیگانہ نیست
لیکن ایں بے چارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہ تو ٹھیری تلمیح ابراہیم علیہ السلام کی جسارت و ہمت کی طرف لیکن ہمارے نزدیک عشق و عقل کی باہمی تفریق ظاہر کرنے کے لئے موسیٰ اور خضر کا وہ مکالمہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا جس کا ذکر سورۂ کہف میں آیا ہے، موسیٰ جیسا جلیل المرتبہ پیغمبر خضر کے سامنے اظہار نیاز مندی کرتا ہے:۔

موسیٰ: اے حریم ذات کے راز دار خضر! اے سیر و سیاحت اور تحصیلِ معرفت کے تشنہ کام مسافر! مجھے بھی فہم و بصیرت کے اُس گنجینے سے بہرہ ور کر جس سے خدائے ذوالجلال کی بے دریغ فیاضی نے تجھے مالا مال کیا ہے!

خضر: اے موسےٰ! اگر میں تجھے اپنی معیت اور ہمراہی کے لئے موزوں سمجھتا تو مجھے تیرا مطالبہ پورا کرنے میں انکار کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تو میری واردات اور حالات پر صبر و تحمل نہ کر سکے گا، میں مجبور ہوں، تیرا مسلک کچھ اور ہے اور میرا ضابطہ کچھ اور، عقل، عشق کے تحیر خیز کارناموں کو دیکھ کر بیتاب ہو سکتی ہے، لیکن عشق خود کو ایک ادنیٰ شے کی رفاقت سے پریشان نہیں کر سکتا۔!

موسیٰ: نہیں اے برادرِ مکرم! آج میری یہ آرزو ضرور پوری ہو جانی چاہیئے، میں فقط آپ کی صحبت سے مستفید ہونا چاہتا ہوں اور آپ کے معاملات میں مطلق دخل نہ دوں گا۔

خضر: بہت اچھا، اس چیز کا فیصلہ پیش آمدہ واقعات پر ہے اور میں دیکھوں گا کہ آپ اُن کی بجا آوری میں ضبط و خودداری کا کتنا ثبوت دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس دوران میں میری طرف سے جو کچھ سرزد ہو، اس پر تمہیں کسی قسم کا سوال نہیں اٹھانا ہوگا!

موسیٰ: آپ مطمئن رہیں، میں آپ کے حکم کی تعمیل بدل و جان کروں گا اور کوئی حادثہ میری خاموشی اور متابعت میں خلل انداز نہیں ہو سکے گا!

یہ کہہ کر موسیٰ خضر کے ساتھ ہو لئے، اس ہمراہی کا سب سے پہلا اثر دریا کے سفر میں ظاہر ہوا، دونوں کشتی پر سوار تھے لیکن جب اس پار پہنچے تو خضر نے کشتی میں ایک طرف سے دیدہ و دانستہ سوراخ کر دیا۔

موسیٰ: (ہمدردی اور حیرت کے جذبات سے بے خود ہو کر) اے حضرت!

آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ ایک تو اُس غریب کی کشتی میں سوار ہو کر دریا کو عبور کیا اور پھر اس احسان کے عوض بیٹھے بٹھلاتے اس کی کشتی توڑ ڈالی؟ یہ کہاں کا دستور ہے؟

خضر: اے موسیٰ! میں نہ کہتا تھا کہ تیری ظاہر بین عقل قدرت کے اسرار و غوامض کا احاطہ نہیں کر سکے گی اور تو عشق کے مافوق العادت کارناموں کو دیکھ کر بے خود ہو جائے گا۔

موسیٰ: بے شک مجھ سے بھول ہوئی اور میں جلدی سے بول اٹھا، اس دفعہ معافی کا خواستگار ہوں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

اس کے بعد موسیٰ اور خضر پھر روانہ ہوئے، چلتے چلتے راستہ میں ایک لڑکا دکھائی دیا، اور خضر نے آناً فاناً اُسے ہلاک کر دیا۔

موسیٰ: (غضبناک ہو کر) ایں! اس معصوم ہستی نے آپ کا کیا قصور کیا تھا، جو بلا وجہ اس کی جان لے لی۔ میری روح اس ظلم و زیادتی کو دیکھ کر خوفِ خداوندی سے لرز رہی ہے۔

خضر، موسیٰ، اپنے عہد کو یاد کر اور نادانی سے باز آ، تو بار بار ایک مجوزہ قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے، اس لئے میں تجھے اپنے سے جدا کرنے پر معذور ہوں۔

موسیٰ: افسوس! حادثات کی سخت اور ناقابل برداشت ضرب میرے شیشۂ تحمل کو پاش پاش کئے دیتی ہے اور میں گفتگو کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں، مگر خیر اس دفعہ اپنے عہد کی پابندی نہ کر سکا، تو

خود بخود آپ سے جدا ہو جاؤں گا۔ آپ مجھے کچھ اور مہلت دیں۔

خضر: بہت اچھا، یہ تمہارا آخری موقع ہے، اگر اب بھی تم نے میرے معاملات میں بدستور مداخلت کی، تو پھر میں ہمیشہ کے لئے تمہیں خیرباد کہہ دوں گا۔

دونوں پھر روانہ ہوئے۔ سفر کے بعد سے اکتائے ہوئے بالآخر ایک شہر میں پہنچے۔ بھوک کی شدت ستا رہی تھی۔ اس لئے اہالیانِ شہر سے طعام کی درخواست کی، لیکن وہ کچھ ایسے روکھے پھیکے اور بے مروّت سے لوگ واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے ان کی بات پر کان تک نہ دھرا، اور یہ کھانے سے مایوس ہو گئے۔ پاس ہی کسی جگہ ایک دیوار گر رہی تھی، خضر نے جب اُسے دیکھا، تو موسیٰ کو اپنے ساتھ ملا کر اس کی تعمیر شروع کر دی۔ موسیٰ علیہ السلام بھوک کی بے تابی سے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے رہے مگر ایک تو پاس عہد کے خیال سے اور دوسرے مزدوری کی امید پر برابر کام کرتے چلے گئے۔ بالآخر دیوار مکمل ہو گئی اور جب خضر نے کسی شخص سے بھی اجرت کا مطالبہ نہ کیا، تو موسیٰ جھٹ بول اُٹھے۔

موسیٰ: اجی حضرت! آپ نے یہ منطق کہاں سے سیکھی ہے کہ بھوک سے اپنی جان پر بن رہی ہو، کوئی کھانے تک کو نہ پوچھے اور خالی پیٹ دیوار تعمیر کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں، آخر جسے ضرورت ہوتی وہ خود اپنا کام کرا لیتا۔ ہمیں یہ بلا اپنے سر ڈالنی کیا ضرور تھی؟

خضر: موسیٰ! حجت پوری ہوتی اور تو اپنا قول ہار گیا۔ اب سُن کہ عقل جن چیزوں کو سطحی نظر سے دیکھ کر حیرت زدہ ہوئی تھی، اور ذہن و شعور کی

فرمائیگی جن حقائق کا احاطہ کرنے سے عاجز رہی، عشق نے ان میں کیا مصلحت رکھی ہے؛ کشتی میں نے اس لئے توڑی تھی کہ اس کے مالک چند غریب لوگ تھے۔ علاقہ کا حاکم ایسا ظالم اور جابر شخص تھا جو تمام کشتیاں غصب کر لیا کرتا تھا، اس لئے میں نے بر سبیلِ احتیاط ایسا کیا کہ اُن کا سفینہ اس زد سے محفوظ رہے۔ پھر لڑکا اس لئے ہلاک کر دیا گیا کہ میں نے اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر اس میں کفر کے آثار دیکھے۔ حالانکہ اس کے والدین ایماندار تھے۔ پس انہیں کیوں اس پیش آنے والے فتنہ سے نجات نہ دلائی جاتی۔ اور بالآخر دیوار اس لئے تعمیر کی کہ اُس کے نیچے ایک خزانہ مدفون ہے جس کا تعلق دو ایسے یتیم بچوں سے ہے جن کا کوئی والی وارث نہیں، سو قدرت نے مناسب جانا کہ ان کا یہ حق ان کے بالغ ہونے تک چوری چکاری سے محفوظ رہے اور بعد ازاں وہ اس سے آرام کی زندگی بسر کر سکیں، یہ ہیں وہ باتیں جو سراسر خدا کے اشارے سے عمل میں آئی ہیں جنہیں صرف "عشق" ہی ادراک کر سکتا ہے اور جن میں عقل کو سوائے انتشار کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، سو فرائض کے لحاظ سے تیرا لائحہ عمل کچھ اور ہے اور میرا طریق کار کچھ اور، میں تجھ سے مطمئن نہیں ہو سکتا اور تو مجھ سے نہیں، پس خدا کی اس قائم کردہ تقسیم پر شاکر رہ، اور اُس مقام تک پرواز کرنے کی کوشش نہ کر جہاں پہنچنے کے لئے تیرے بازوؤں میں کافی سے زیادہ توانائی نہیں۔

ان واقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے

"ضربِ کلیم" کی نظم "علم و عشق" میں علم کے "پیدا سوال" اور عشق کے "پنہاں جواب" ہونے کی توجیہہ غالباً انہیں حقائق کی بنا پر کی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنتِ فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتحِ باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

انہیں شواہد کی بنا پر "بالِ جبریل" میں پیرِ رومی مریدِ ہندی کے

اس سوال کے جواب میں کہ انسان کے لئے دنیا میں کون سا سودا عملی طور پر مفید ہو سکتا ہے، ارشاد فرماتے ہیں ؎

زیرکی بفروش و حیرانی بخر زیرکی ظن است و حیرانی نظر

یاد رہے کہ اس جگہ حیرانی سے مراد "عشق" ہے اور اس لحاظ سے عمر خیام کا قول بھی کس قدر صحیح ہے ؎

"تا بودہ دلم ز عشق محروم نہ شد
کم بود ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
اکنوں کہ ہمی بنگرم ز روئے خرد
معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

یعنی "جب تک میرا دل عشق سے فیضیاب تھا، میں قدرت کے تمام حقائق و معارف کو بآسانی سمجھ لیتا تھا لیکن اب جو اس سے برطرف ہو کر محض عقل کی رُو سے دیکھتا ہوں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

غالبؔ اپنے بلاغت آفریں اور مترنم انداز میں اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادۂ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

اس شعر میں "وحشت" سے مراد عشق ہے اور "دشت" بھی عشق ہی کی صحرا نوردی سے عبارت ہے، کہتا ہے کہ دو عالم کا پرتو اسی وقت میرے آئینۂ دل پر پڑا جب میں نے دوسرے تمام طریقوں کو چھوڑ کر عشق کا مسلک اختیار کیا۔ اس دشت میں جو بھی راستہ ہے وہ گویا عجائبات

قدرت کی ایک ایسی شیرازہ بندی ہے جس میں حقیقت اور صداقت کا جلوہ خاطر خواہ طور پر دیکھا جا سکے۔

ان تمام بزرگوں کے اقوال اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن ہمارے نزدیک تو عشق اور عقل کی تفریق کرنا ہی سرے سے ایک زائد اور پر تکلف بات ہے، ہمارے بیان کردہ شواہد کی رُو سے عشق بغیر عقل کے ایک مہمل اور ناقص سی شے ہے، اور عقل بغیر عشق کے ایک اپاہج سی چیز معلوم ہوتی ہے، حق تو یہ ہے کہ انسانی حواس کی تکمیل اور خود زندگی کا نشوو ارتقا ہی ان ہر دو اشیا کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے، یہ گویا دو پر ہیں جن سے ایک کی عدم موجودگی میں بھی ہم قدرت کی وسیع فضاؤں میں پرواز نہیں کر سکتے، جہاں معرفت کے لئے ایک چشمِ بینا اور قلبِ سلیم کی ضرورت ہے، وہاں ساتھ ہی نورِ خرد کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ عشق سے تو خیر ہم ایمان و یقین اور حسنِ عمل جیسی نعمتیں حاصل کرتے ہیں لیکن اگر دنیا میں محض عقل ہی کی فرمانروائی ہوتی اور عشق نہ ہوتا، تو سوائے کفر و انکار کے اور کیا حاصل ہو سکتا تھا اور اس سے پہلے آپ سُن چکے ہیں کہ ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات

ہاں صاحب بات پتے کی ہے کہ جہاں تک عقائد میں حشر و نشر، جزا و سزا، اور الٰہیات کا تعلق ہے، عشق کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہماری رہبری کر ہی نہیں سکتی، لیکن بایں ہمہ "عقل" سے بے نیازی کا دعوےٰ

بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نہ ہوئی۔ تو "مشاہدہ" کی تعمیل کیونکر ہو گی، اور مشاہدہ تکمیل ایمان میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اتنی اہمیت کہ خدا کو بھی اس کے حق بجانب ہونے سے انکار نہیں، ابراہیمؑ نے اپنے پروردگار سے سوال کیا تھا کہ رب ارنی کیف تحی الموتی "اے خدا! تو مردہ اجسام کو دوبارہ کیونکر زندہ کرے گا؟" اُدھر سے اعتراض ہوا اولم تومن "کیا تجھے اس پر ایمان نہیں جو مشاہدہ سے اس کی تصدیق حاصل کرنا چاہتا ہے؟" کہا۔ بلی ولکن لیطمئن قلبی یعنی "ایمان تو بے شک ہے (اور تمام دنیا کے انسانوں سے بڑھ کر ہے) لیکن اس سے فقط میں اپنے دل کا "اطمینان" چاہتا ہوں!" چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ مطالبہ کسی طرح سے ناگوار نہ سمجھا گیا، اور ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدہ کی رُو سے عملی طور پر اطمینان ہو گیا!

تو آخر یہاں سے بھی عقل ہی کا اثبات ہوا نا، اور اس طور پر ہوا کہ وہ حقیقت میں عشق کی رہنما ہے۔ ایمان اور عمل کو تازگی بخشتی ہے اور انسانیت کی تکمیل میں ہر طرح سے ممد و معاون ہے۔

اصل میں سچ پوچھئے تو وہ "حکمت" جسے قرآن مجید کی اصطلاح میں "خیر کثیر" سے تعبیر کیا گیا ہے، فی الحقیقت عشق اور عقل کی باہمی مماثلت ہی کا ایک دوسرا نام ہے یا بالفاظِ دیگر دل اور دماغ کے باہمی ربط اور وحدتِ فکر و نظر سے جو تاثرات پیدا ہوں گے، انہیں "حکمت" کہا جائے گا، جس سے بڑا شرف انسانیت کے لئے اور کوئی نہیں!

اس لئے ہمارے نزدیک اس باب میں سب سے زیادہ صحیح اور معقول فیصلہ وہی ہے، جسے ڈاکٹر صاحب اپنے ہی الفاظ میں یوں صادر فرما چکے ہیں ؎

نوا مستانہ در محفل زدم من　　شرارِ زندگی بر گل زدم من
دل از نورِ خرد کردم ضیا گیر　　خرد را بر عیارِ دل زدم من

یہاں عشق سراپا عقل بن گیا، اور عقل نے خود کو عشق کے جاودانی تاثرات میں جذب کر دیا اور اس طرح دونوں کے ملاپ سے "انسانِ کامل" نے ظہور پایا۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ "خرد" کا سوز واثر ہی فی الحقیقت عشق اور ذوقِ تپش سے عبارت ہے۔ اسی سے باطنی کوائف اور سچے احساسات کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ دونوں لازم ملزوم ہیں اور جو خرد اپنے اندر یہ صلاحیت نہ رکھتی ہو، اُسے خرد کہنا ہی نہیں چاہیئے۔

دل

اس عنوان کو بھی ہم اپنے گزشتہ سلسلۂ بیان یعنی عشق اور عقل کا تتمہ قرار دیتے ہوئے، آپ پر واضح کر دینا چاہتے ہیں، کہ دل انسان کے سینے میں تمام روحانی تاثرات کا مرکز ہے۔ دل کی زندگی اور اس کا سوز و ساز عشق کے بغیر ممکن نہیں، یا بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ

سوزِ عشق ہی کی تکمیل کا نام "دل" ہے۔ دل کو اگر ایک فانوس تصور کیجئے تو عشق اس فانوس کا شعلہ ہوگا جس سے اس کی زینت ہے۔ عشق کے بغیر دل محض ایک ویرانہ ہے اور زندگی وبالِ جان!

علامہ اقبال دل کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں ؎

چہ می پُرسی میانِ سینہ دل چیست
خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد
دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن
چو یک دم از تپش افتاد گِل[۱] شد

یعنی یہی عقل جس کی ہم مذمت کرتے ہیں جب سوزِ عشق اختیار کرے تو سراپا دل بن جاتی ہے تو پھر دل بھی اسی وقت تک دل ہے جب تک اس میں عشق کی حرارت موجود ہے، لیکن جب یہ باقی نہ رہے، تو وہ اپنے حقیقی کمال کو کھو بیٹھتا ہے اور ایسی حالت میں اس کی حیثیت گوشت کے ایک بے حس لوتھڑے سے زیادہ نہیں رہتی۔ مولانا رومؒ بھی اس مفہوم کی تائید کرتے ہیں، ان کا شعر ہے ؎

علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر دل زنی یارے بود

فرماتے ہیں کہ اسی عقل کو اگر تم صرف محسوسات کے اندر صرف کرتے ہو تو یہ تمہارے لئے وبالِ جان ہے، اور یہی عقل ہے، جو سوزِ عشق سے کسبِ فروغ کرنے کے بعد تمہاری زندگی کو حقیقی معنوں میں زندگی بنا دیتی ہے۔

---

[۱] گِل۔ کیچڑ

توان تمام باتوں سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا، کہ خودی، خودی کے ساتھ، عشق، عشق کے ساتھ سوزِ دل تمام ایک دوسری کے لئے نہایت اہم اور ضروری چیزیں ہیں، چنانچہ "اسرارِ خودی" میں ڈاکٹر صاحب ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ؎

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست

دل از عشقِ او توانا مے شود
خاکِ ہمدوشِ ثریا مے شود

اس کے علاوہ اُردو میں بھی "دل" کی ممکنات کو بہت اچھے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے، یہاں بھی اس کی تخلیق کا اصل سرمایہ عشق ہی ہے فرماتے ہیں۔

یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہو گی
جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرعِ[1] ہستی تو اُگا دانۂ دل

---

[1] کھیتی

حُسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل
خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکستر پروانۂ دل
عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

ان میں اگر آپ سب سے پہلے شعر کا پورا لطف اٹھانا چاہیں، تو لفظ "مے" پر غیر معمولی دباؤ دیں، اس طرح یہ اپنے لطائف اور نکات کو بوجہِ احسن پیش کر دے گا۔ ڈاکٹر صاحب کا منشا یہ ہے کہ "الٰہی جب پیمانۂ دل کا خط ہی انسان کو ایک دائمی اور ابدی زندگی سے مالا مال کر دیتا ہے، تو پھر اس کی "مے" اپنے اندر کیا کچھ معجزات نہ رکھتی ہوگی"!

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

رونق ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اور اصل بات تو یہ ہے ؎

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

بقائے آرزو

اوپر یہ کہا جا چکا ہے کہ دل سراپا عشق ہے، لیکن یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ عشق بھی بجائے خود کوئی چیز نہیں، جب تک کہ آرزو اس کی محرِک نہ ہو، عشق کی بقا آرزو کی بقا سے وابستہ ہے، جب تک آرزو سینے کے اندر زندہ ہے، تب تک عشق کا سوز بھی قائم ہے لیکن جوں ہی آرزو فنا ہوئی، انسانیت کے تمام فضائل ساتھ ہی رخصت ہو لئے۔ پس آرزو بھی انسانی زندگی کی ایک بہترین خصلت ہے۔ لہٰذا احساسِ خودی اور عزتِ نفس کے لئے اس کا قرار بھی نہایت ضروری ہے علامہ اقبال نے آرزو کی تجدید کے لئے خاص طور پر تاکید فرمائی ہے اور جگہ بہ جگہ اس کے فوائد کا ذکر کیا ہے، وہ مغرب کے گم کردہ راہ فلسفی شوپن ہار کی طرح یہ نہیں کہتے کہ "خواہش" ایک امرِ مذموم ہے، یا زندگی ناامیدی اور قنوطیت سے عبارت ہے، بلکہ وہ ایمان اور قرآن کی روشنی میں رجائیت اور آرزو ہی کو زندگی کا صحیح فروغ سمجھتے ہیں۔ شوپن ہار کو تو زندگی میں نہایت تلخ تجارب حاصل ہوتے، جس کی ذمہ داری سراسر

اس کی اپنی ذات پر ہے لیکن ڈاکٹر اقبال اس کی طرح شخصی حالات کو تمام بنی نوعِ انسان پر منطبق کر کے ان کے مستقبل کا خون کرنا نہیں چاہتے. چنانچہ "اسرارِ خودی" میں کیا خوب فرمایا ہے ؎

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار — تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست — فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را — خضر باشد موسئِ ادراک را
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات — غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات
چون ز تخلیقِ تمنا باز ماند — شہپرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موجِ بیتابے ز دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند — دفترِ افعال را شیرازہ بند
زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد — شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

گرم خونِ انسان ز داغِ آرزو
آتشِ این خاک از چراغِ آرزو
از تمنا مے بجام آمد حیات
گرم خیز و تیز گام آمد حیات

زندگی مضمونِ تسخیر است و بس
آرزو افسونِ تسخیر است و بس
زندگی صید افگن و دام آرزو
حسن را از عشق پیغام آرزو

جس قدر زندگی اور عمل کے لئے آرزو مفید ہے، اس سے کہیں زیادہ "مایوسی" سفر بھی ہے، نا امیدی اور اوہام کے غلبے سے قوتِ تخلیق بالکل فنا ہو جاتی ہے. اس لئے ایک اور جگہ رقمطراز ہیں ؎

مرگ را ساماں ز قطع آرزوست
زندگانی محکم از لا تقنطوست

نا امید از آرزوئے پیہم است
نا امیدی زندگانی را سم است

زندگی را یاس خواب آور بود
ایں دلیل سستیٔ عنصر بود

از دمش میرد قوائے زندگی
خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

پس آرزو کے ساتھ زندگی اور زندگی کے ساتھ آرزو کا ہونا لازمی ہے جس شخص میں جستجو اور تلاش کا جذبہ نہیں وہ ایک چوپائے سے بھی بدتر ہے. چنانچہ غالب کا فلسفہ بھی اسی خیال کا مؤید ہے. وہ اپنے شاعرانہ رنگ میں فرماتے ہیں ؎

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

یعنی اگر حالات اس کے مساعد نہیں ہیں کہ تم فی الحال اپنی آرزو کو عمل میں لا سکو، تو کم از کم امید کا رشتہ تو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے.

پھر اسی ضمن میں حضرت علامہ اقبال "پیامِ مشرق" میں بھی آرزو کی وسعت اور ضرورت کا اظہار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

جہاں یک نغمہ زارِ آرزوئے　　　بم و زیرش ز تارِ آرزوئے
بچشمم ہر چہ ہست و بود باشد　　　دمے از روزگارِ آرزوئے

یعنی دنیا آرزو ہی کے فیض سے معمور نظر آتی ہے اور یہ ایک ایسا ساز ہے جس کے حیات افروز نغموں نے فضائے عالم کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، ذرہ ذرہ اسی کے فیض سے متحرک دکھائی دیتا ہے.

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ آرزو اور جستجو کا جذبہ ہر چیز کی فطرت میں ہے اور وہ اس کی بجا آوری کے لئے قدرتی طور پر مجبور ہے۔ چنانچہ ؎

درونِ سینۂ ما سوزِ آرزو ز کجاست
سبو ز ماست ولے بادہ در سبو ز کجاست؟
گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ما کفِ خاکیم
بہ ذرہ ذرۂ ما درد جستجو ز کجا ست
نگاہِ ما بگریبانِ کہکشاں افتد
جنوں ما کجا شورہائے و ہو ز کجاست

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ سعی سے اکتا کر مایوس نہیں ہو جانا چاہیئے بلکہ اس نارسائی کو بھی اپنی خامی کی دلیل خیال کرتے ہوئے اس کی تکمیل کرنی چاہیئے ؎

گماں مبر کہ نصیبِ تو نیست جلوۂ دوست
درونِ سینہ ہنوز آرزوئے تو خام است

یعنی ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پس حاصل اس تمام بحث کا یہ ہے کہ خدا پر یقین رکھ اور آرزو کا رشتہ کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہ دے ؎

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اگر تم نے اپنے کو فقط "آرزو مند" رہنے کا عادی بنا لیا' اور اس آرزو کو پوری مستعدی سے "عمل" میں نہ لائے تو وہی آرزو تمہارے اور تمہارے دل کے لئے ایک خطرناک بیماری ثابت ہوگی، وہ خود آہستہ آہستہ تحلیل ہو کر مٹ جائے گی، اور اپنے زہریلے تاثرات تمہارے جسم میں چھوڑ جائے گی جس کا نتیجہ یقیناً ایک عبرت انگیز اور حسرتناک موت ہے ؎

بر کشت و خیاباں پیچ' بر کوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بخود پیچد' میرد بسحاب اندر

نٹشے اسی کی تائید میں کہتا ہے :-

"انسان کے لئے اب وقت ہے کہ وہ اپنے لئے ایک خاص مطمح نظر اور نصب العین قرار دے لے اور اس کے لئے اب موقع ہے کہ وہ اپنے دل میں کسی بلند ترین مقصد کے لئے تخم ریزی کرے۔

اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی یہ کھیتی (یعنی دل) ہنوز اُن مقاصد کی تعمیل اور بجاآوری کے لئے کافی طور پر زرخیز ہے لیکن جب وہ شوریدہ اور بے کار ہو گئی، تو اس سے کسی قسم کا خوشنما پودا یا بار آور درخت پیدا نہیں ہو سکے گا!" [1]

ہجر و فراق

اس کے بعد آپ کو یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ آرزو بھی بجائے خود کوئی چیز نہیں۔ جب تک کہ "ہجر" اس کی حیات و بقا کا سامان پیدا نہ کرے، یا بالفاظِ دیگر آرزو کی تخلیق و تولید بھی ہجر و فراق کے ظہور سے وابستہ ہے، آرزو کا قیام اور اس کا نشو و ارتقا بغیر ہجر کے بالکل ناممکن ہے۔ زندگی کی حقیقی راحت ہجر سے ہے، ہجر ہی نے آرزو اور شوق کا سوز و ساز کائنات کی ہر چھوٹی بڑی شے کو تفویض کیا ہے۔ یہ انسان کا ایک پیدائشی جذبہ ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ "پیامِ مشرق" میں اسی شرف و فضل کا ذکر فرماتے

---

[1] خطبات زرتشت عنوان "تجدید آرزو"

ہوتے لکھتے ہیں کہ ؎

بگو جبریل را از من پیامے   مرا آں پیکرِ نوری نہ دادند
دلے تاب و تب ما خاکیاں بیں   بہ نوری ذوقِ مہجوری نہ دادند

لاریب انسان کے لئے ہجر سے زیادہ راحت بخش اور مایۂ ناز چیز اور کوئی نہیں ہوسکتی، دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی
درماں نیا فریدی آزار جستجو را

یہی وجہ ہے کہ زندگی کا دوام سوزِ آرزو کی ناتمامی پر موقوف ہے اور شوق کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے مقصد اور مدعا سے محروم رہے۔ آرزو اور شوق کے لئے وصال سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے، یہاں زندگی کی تمام لذتیں معدوم ہوجاتی ہیں اور یہ دنیا ایک افسردگی اور موت کی دنیا ہے، چنانچہ کیا خوب فرمایا ہے کہ ؎

دوامِ ما ز سوزِ ناتمام است
چو ماہی جز تپیدن بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل
تپیدِ یک دم و مرگِ دوام است

پس ایک دائمی زندگی کا راز ہجر اور صرف ہجر ہی کے اندر پوشیدہ ہے، اس لئے ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصال
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

مرزا غالبؔ کا بھی بالکل یہی نظریہ ہے اور وہ بھی ہجر ہی کو زندگی کا حقیقی راز قرار دیتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ

گر ترے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یعنی وصال سے شوق و آرزو کا جذبہ بالکل فنا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تم دیکھتے نہیں کہ ہجر ہی نے موج کو محیطِ آب میں سوزِ تپش سے مضطرب اور بے قرار کر رکھا ہے لیکن اگر وہی موج ساحل سے آن ملے اور وصال حاصل کر لے تو آنِ واحد میں معدوم ہو کر رہ جائے گی۔

اسی حقیقت کو ڈاکٹر صاحب دوسرے پیرائے میں بیان فرماتے ہیں۔

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

ٹیگور اس مفہوم کو کسی قدر لطیف انداز میں یوں ادا کرتا ہے ؎

"جب آفرینش نئی نئی تھی اور ستارے اپنی پہلی روشنی میں تھے، رشیوں نے آسمان پر جلسہ کیا اور سب نے مل کر گایا کہ "واہ ری تصویرِ کمال، واہ ری مسرتِ غیر ناقص!" لیکن ان میں سے ایک دفعتاً پکار اٹھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زنجیرِ ضیا میں [illegible] اور ان تاروں میں سے کوئی تارا کھو گیا ہے۔ بربط کا زریں تار اتر گیا، گانا بند ہو گیا اور وہ سب کے سب گھبرا کر چلا اُٹھے۔ ہاں، ہاں، ضائع شدہ تارا سب سے اچھا تھا اور وہی تمام آسمانوں کی رونق تھا۔

اس دن سے اس کی تلاش جاری ہے اور اک شور یہاں سے وہاں تک بلند ہے کہ دنیا نے اس تارا میں اپنی ایک مسرت کھو دی۔

صرف رات کی گہری خاموشی میں ستارے مسکراتے ہیں اور باہم سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ جستجو بے کار ہے "غیر منقطع تکمیل" تو ہر جگہ ہے۔"[1]

"زبورِ عجم" میں بھی ہجر و فراق کے فائدوں کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ میں یہاں صرف تین شعر نقل کئے دیتا ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

جدائی خاک را بخشند نگاہے — دہد سرمایۂ کوہے بکاہے
جدائی عشق را آئینہ دار است — جدائی عاشقاں را سازگار است

اگر ما زندہ ایم از دردمندی است
وگر پائندہ ایم از دردمندی است

"بالِ جبریل" کے یہ چار شعر بھی سراسر "جدائی" کی نسبت کہے گئے ہیں ؎

سورج بنتا ہے تارِ زر سے — دنیا کے لئے ردائے نوری
عالم ہے خموش و مست گویا — ہر شے کو نصیب ہے حضوری
دریا کہسار چاند تارے — کیا جانیں فراق و ناصبوری
شایاں ہے مجھے غمِ جدائی
یہ خاک ہے محرمِ جدائی

اسی کتاب میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

---

[1] گیتان جلی صفحہ ۹۴

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب

گرمیٔ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق

"بانگِ درا" کے مندرجہ ذیل اشعار بھی گویا ہجر کے اسی ذوق کو نمایاں کر رہے ہیں، ملاحظہ ہو ؎

شام جس کی آشنائے نالۂ "یا رب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں

جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

گویا یوں سمجھ لیجیے کہ اگر ہجر سراسر جد و جہد، استقلال اور آرزو کا سرمایہ دار ہے، ایک جوش کھاتا ہوا دریا ہے، ایک رواں دواں چشمہ ہے تو "وصل" کو اس کے بالمقابل ایک ایسا حوض تسلیم کرنا ہوگا، جس کا پانی حرکت نہ کرنے کی وجہ سے ایک ہی جگہ کھڑا کھڑا بدبودار، بدذائقہ اور بدرنگ ہو گیا ہو ؎

صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
(غالبؔ)

"قطرہ" گو بجائے خود کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو، لیکن ہمارے نزدیک ذوقِ طلب اور لذتِ جستجو کے ہوتے ہوئے وہ ساکن اور غیر متحرک سمندر سے بدرجہا اچھا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اکثر دفعہ خاموش اور سُست مزاج قومیں ایسے ایسے شاندار کارنامے بجا نہیں لا سکیں، جو بہت سے مستعد اور باہمت "افراد" نے سرانجام دیئے ہیں. تاریخ نے اُن قوموں کو عبرت کا ایک بھولا ہوا افسانہ بنا دیا. حالانکہ اِن افراد کے اثر اور نفوذ کو روز بروز دوبالا کرتی چلی جاتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُن کی بوسیدہ ہڈیاں بھی انسانی قلوب پر حکومت کر رہی ہیں. اس مقصد کی تائید اور وضاحت کے لئے ہمیں اس جگہ لازمی طور پر سٹیون سن (Stevenson) کے ایک مقالۂ علمیہ کا خلاصہ دینا ہوگا، وہ اپنے حکمت آموز پیرایہ میں کہتا ہے:۔

"مسرّت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور دنیا میں کون لوگ حقیقی طور پر مسرور رہ سکتے ہیں؟ یہ ہے وہ سوال جس کا جواب میں آپ کو اپنے آیندہ بیانات میں دوں گا. سچ پوچھئے تو ہماری اصل خوشی اور زندگی کا حقیقی سوز و ساز ایک غیر متناہی آرزو میں پوشیدہ ہے، ہمارا جذبۂ تخلیق صرف اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے جبکہ ہم اپنے مقاصد سے محروم رہیں، گویا اس طور پر ہماری آرزو اور ہمارا شوقِ سفر اُن دو آنکھوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں، جن سے ہم دنیا کی رنگارنگ چیزوں کو دیکھتے، ان کی دلربائی سے لطف اٹھاتے، اور نتیجہ کار اُن کی تحصیل میں پوری سرگرمی سے منہمک ہو جاتے ہیں.

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے سامنے ایک نصب العین اور ایک مطمح نظر قائم کرتے ہیں، لیکن ہنوز ہم اس تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ ہماری طبیعت اُسے چھوڑ کر کسی اور خواہش کی محرک ہوتی ہے، اور ہم اُسے ناکافی سمجھتے ہوئے دوسری شے کی جانب لپک پڑتے ہیں، پھر اس بے صبری کی وجہ کیا ہے؟ اور ہماری پیاس کیوں بجھنے میں نہیں آتی؟ صرف اس لئے کہ فطرت کا بے دریغ فیضان اور قدرت کی غیر متناہی گنجائش ہمیں ایک مسلسل اور بے پایاں کوشش میں مصروف رکھ کر زندگی کے ایک ایک لمحے کو ہمارے لئے جنت نظیر بنا دینا چاہتی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ آرزو کا تسلسل اور جستجو کی محرومی ہی ہے، جو ہمیشہ کے لئے ہمیں مسرور اور مطمئن رکھتی ہے۔ اسی سے ہمارے دلوں کی حیات ہے، اسی کے پیشِ نظر خون بھی ہماری رگوں میں رواں دواں ہے، اور اسی کا موجود نہ ہونا ہمیں مردہ اور مایوس بنا دیتا ہے، فرض کرو کہ ایک مسافر کسی ریل میں بیٹھا ہوا سفر کر رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک نہایت دلچسپ اور مصوّر کتاب بھی ہے۔ اب وہ اس کے مطالعے سے محظوظ تو ضرور ہوتا ہے اس کے مضامین پر غور بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جنگل کے گوناگوں مناظر سے بھی لطف اٹھاتا چلا جاتا ہے مگر ساتھ ہی اُسے یہ خدشہ بھی ہے کہ منزل پر پہنچنے سے پہلے کہیں یہ کتاب ختم نہ ہو جائے اور اس طرح میں کہیں اس دلنواز رفیق سفر سے قبل از وقت جدا نہ کر دیا جاؤں۔ اسی طرح سکندر کی نسبت کس کو معلوم نہیں کہ جب وہ بہت سے

ممالک کو پے در پے فتح کرتا ہوا زمین کے اُس کنارے تک پہنچ گیا تو اُس نے غم کے آنسو بہاتے ہوئے بے اختیار کہا کہ اب میں اپنی تسخیر کے لئے اور ممالک کہاں سے مہیا کروں گا؟ اسی طرح کی ایک روایت اڈورڈ گبن کی نسبت بھی ہے۔ کہ جب اُس نے اپنی مشہور کتاب رومن سلطنت کا زوال The decline and fall of the Roman Empire ختم کی تو وہ نہایت غمزدہ ہوا۔ کیونکہ اب مزید کوشش کے لئے اُس کے پاس کوئی مواد باقی نہیں رہا تھا۔

اس سے قطع نظر مصنفین کی حالت کو عام نظر سے بھی دیکھا جائے تو وہ زندگی میں اپنی کارگزاری پر کبھی قانع نہیں ہوئے۔ اور ان کا شوق ہمیشہ انہیں ایک نئے عنوان پر لے آتا تھا۔ یہی حالت مطالعہ کرنے والوں کی ہے۔ ایک نوجوان کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ تھامس کارلائل کی تصانیف کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھا کرتا تھا، لیکن جب اس کی تمام کتابیں ختم ہوگئیں، تو اس نے ایک تعجب خیز حسرت سے دریافت کیا کہ کیا واقعی اب میں اس مسرت سے محروم کر دیا گیا ہوں؟ جب کہا گیا کہ ہاں تو اس نے لاچار اپنے کو رسمی اخبارات کے رحم پر چھوڑ دیا۔ سیاح لوگوں کو دیکھو کہ میدانوں کے میدان اور پہاڑوں کے پہاڑ عبور کرتے چلے گئے ہیں اور ابھی "کاش" کا لفظ بدستور ان کی زبان پر جاری ہے۔ یہی حالت موجدین کی ہے کہ باوجود متعدد اختراعات کے انہیں کبھی تسکین

نہیں ہوتی[1] اسی طرح وہ کون سا مصوّر یا سنگ تراش ہے جو بہتر سے بہتر شاہکار پیش کرنے کے بعد بھی دنیا سے مطمئن اور سیر ہو گیا ہو۔ پھر ساہوکاروں یا سرمایہ داروں کو دیکھو کہ لاکھوں اور کروڑوں روپیہ جمع کر لیتے ہیں، لیکن مرتے وقت ہنوز ان کا ایک نہ ایک صندوق خالی ہے اور وہ اب بھی ھل من مزید کا آخری نعرہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اب ان مثالوں کے علاوہ ذرا دیر کے لئے ازدواجی زندگی پر نظر ڈالو، ہمارے یورپین رسم و رواج کے مطابق پہلے تو ایک شخص کو عرصۂ دراز

---

[1] ایڈیسن کو اس کی عظمت کی وجہ سے سائنسدانوں کا شہنشاہ تسلیم کیا جاتا ہے لیکن تحقیق و جستجو کی نسبت وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی ویسا ہی سرگرم تھا، جیسا کہ اس کو ابتدائی دنوں میں دیکھا جایا کرتا تھا۔ وہ سوتا برائے نام تھا، جہاں اونگھ آئی، اپنی تجربہ گاہ میں بوٹوں سمیت ایک ٹوٹے پھوٹے تخت پوش پر اخبارات کا سرہانہ بنا کر پانچ منٹ کے لئے سو رہے اور بس! حد یہ ہے کہ شادی کے روز جب پارٹی منعقد ہوئی، دلہن کو لایا گیا اور دوست احباب نے ایڈیسن کو غیر موجود پا کر اس کی تلاش شروع کی، تو اس وقت بھی وہ اپنے مخصوص کمرہ میں ایک تجربہ کرتا ہوا پایا گیا اور دروازہ اس وقت کھولا، جبکہ اس چیز کی نسبت ہر طرح سے تسلی کر چکا تھا، وہ کہتا ہے کہ "کسی کام کی نسبت مضبوط ارادہ کر لینے کے بعد اس میں ناکام رہنا بالکل ناممکن بات ہے۔"

سو یہ ہیں "فراق" اور "لذتِ جستجو" کے عملی نمونے اور انہیں کو تسلسلِ حیات کا حقیقی پیامبر سمجھنا چاہیئے۔

طارق

کے لئے محبوب کا طواف کرنا پڑتا ہے، دو مختلف طبائع کا مل جانا بجائے خود ایک ٹیڑھی کھیر ہے، پھر خوشامد منّت سماجت، چاپلوسی، کبھی آگے کبھی پیچھے، خدا خدا کر کے جب اُسے رضا مند کیا۔ اور محبت میں دونوں ایک ہو لئے، تو اب اس سے بھی ایک بڑی دقت اور در پیش ہے اور وہ محبت کا نباہ اور بیوی کی ناز برداری ہے، اُس کے چونچلے پورے کرنا خرچ حسب منشا دینا، زیبائش کرانا، تھیٹر کو لے جانا، آئے تو استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہونا اور بایں ہمہ وقت پڑے تو غیروں سے ملتے ہوئے دیکھ کر "خاموش" بھی رہنا، پھر چند روز نہیں گذرنے پائے تھے کہ "آف سپرنگس" کی نوبت آئی اور بچے بھی پیدا ہونے شروع ہو گئے، یہاں سے ایک اور مصیبت کا آغاز ہوتا ہے، بچے کے دانت نکالنے کا غصہ کون سے والدین نہیں جانتے، پھر اُن کی پرورش، پرورش کے بعد تعلیم اور تعلیم کے بعد شادی بیاہ کی ذمہ داری ابھی بعد کی چیزیں ہیں، پھر جب وہ بیاہے جا چکیں، تو اُن کے بچّوں کی صحت اور عافیت کا بھی ویسا ہی خیال رکھنا، جیسا کہ اپنے بچّوں کا رکھا جاتا تھا۔

تو ان تمام مقدمات اور ان تمام مثالوں سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس میں ایک کے بعد دوسری کڑی ہمارے سامنے آتی چلی جاتی ہے۔ اور فی الحقیقت اسی سے ہمارا ماحول پُر کیف اور دلچسپ بنتا ہے۔ اگر ہمارے مقاصد سرے سے ختم ہو جائیں یا بالفاظ دیگر اگر ہم "وصال" سے

آشنا ہو کر "ہجر" کی لذت کو کھو بیٹھیں، تو لازمی طور پر زندگی کی رنگینی، اس کا تعطر، اس کا انعکاس اور نغمہ ہم سے رخصت ہو جائے گا۔ اور یہ حالت ایک ایسی حالت ہے جس پر موت کو بدرجہا ترجیح دی جا سکتی ہے۔

آپ نے اندازہ فرمایا ہو گا کہ سٹیون سن کا یہ مقالہ کس قدر نادر اور بصیرت افروز ہے، اور اس نے مختلف مثالوں سے بھی اپنے مقصد کو کس خوبی سے واضح کیا ہے، اسی کو اگر ہم مختصر طور پر کہنا چاہیں یا اصل مدعا پیش نظر لانا مقصود ہو، تو ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں یوں کہیں گے ؎

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

اسی مفہوم کو اور اسی حکمت کے زیر اثر شوپن ہار کا بیان بھی ملاحظہ ہو۔

"ہم جو کچھ کرتے ہیں، چاہتے ہیں کہ جلد ختم ہو جائے، ہم کام کر کے مسرت حاصل کرنے کے لئے بے صبر ہوتے ہیں، لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ آخری منظر جتنا دور ہو سکے اچھا ہے اور پردۂ اختتامی جتنی دیر میں گر سکے بہتر ہے۔"

ٹیگور بھی نفسیات کے ان گہرے نکات سے بے خبر نہیں، اس لئے ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے :۔

"یہ دردِ فراق ہی ہے، جو تمام عالم میں لبسیط ہے اور جس سے بے شمار شکلیں غیر محدود آسمان میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہی غم جدائی ہے، جو تمام رات ایک تارہ سے دوسرے تارہ تک خاموشی سے نکا کرتا ہے اور جولائی کی

باران تاریکی میں سرسرانے والی پتیوں کے درمیان نم ہوکر رہ جاتا ہے۔
یہی پھیلا ہوا درد ہے، جو عمیق ہوکر محبتوں اور آرزوؤں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسانی مساکن میں تکلیف و مسرت بن جاتا ہے اور یہی ہے جو شاعر کے دل سے نکل کر گدازِ لحن و رقت نغمہ ہو جاتا ہے"۔
اس کے علاوہ اگر عالم حسن میں ہجر کا احساس معلوم کیجیے تو یہاں بھی اِسے آبِ حیات سمجھا جاتا ہے، مثلاً گوئٹے[1] اپنی ایک نظم کا عنوان "مسرتِ فراق" قرار دیتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں۔

---

[1] گوئٹے جرمنی کا ایک الہامی شاعر ہے، تاریخ ادبیات میں اُسے یورپ کا بہترین شاعر تسلیم کیا گیا ہے شلر اور یہ دونوں بڑے گہرے دوست تھے اور ان کی مجلسیں خوب پُر لطف ہوا کرتی تھیں۔ گوئٹے کو ایک زمانہ تک مصوری کا بھی بہت شوق رہا ہے لیکن جب وہ اٹلی گیا اور وہاں کے کھنڈرات نے اس کے دل پر غیر معمولی اثر کیا، تو اس نے موقلم کو خیرباد کہہ کر اپنی تمام توجہ شاعری پر مبذول کردی۔ وہ کہتا تھا کہ تصویر ہمارے جذبات و احساسات کی ایسی اچھی ترجمانی نہیں کر سکتی جیسی کہ شعر کر سکتا ہے۔
آخر عمر میں گوئٹے قرآن مجید اور دیوانِ حافظ کا بکثرت مطالعہ کیا کرتا تھا بعض جگہ احادیث کے تراجم بھی کر دیئے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے کہ جنت میں صرف تین جانور داخل ہو سکیں گے۔ ایک ابوہریرہؓ کی بلّی دوسرے اصحاب کہف کا کتا اور تیسرے حضرت عیسیٰؑ کا گدھا۔

گوئٹے کا بہترین کارنامہ "فورسٹ" سمجھا جاتا ہے جس پر جرمن لٹریچر کو بجا طور پر

(باقی صفحہ ۱۶۱ پر)

"اے جوان! آرزو کا رنگ اپنے ہاتھ میں لے، معشوق کی تصویر شب کی تنہائی میں کھینچ اور اس طرح تمام دن اُس کی شعاعِ نظر کے ذریعہ اطمینان اور خوشی کا میٹھا میٹھا رس پیتا رہ، اگرچہ محبت کے صحیح قوانین کوئی عاشق بھی نہیں جانتا، لیکن محبوب کا دیدار حاصل نہ ہو سکنے کی صورت میں دل کی مسرت ہر لحظہ ترقی کرتی رہی ہے اور یہ پھول کبھی مرجھانے نہیں پاتا۔

اے دوست! وقت اور جدائی کی غیر فانی طاقتیں ہمارے خون کو بہت جلد منجمد نہیں ہونے دیتیں اور ان کی روشنی اپنے اندر ستاروں کی سی بلندی اور جگمگاہٹ رکھتی ہے۔ اگرچہ میرے حواس ایسی حالت میں غم ضرور محسوس کرتے ہیں، لیکن پھر بھی میرا سینہ روز بروز فراخ ہوتا چلا جاتا ہے اور میں اسے پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط اور زیادہ مطمئن پاتا ہوں۔ اے دوست، خدا کی رحمتیں ہوں ایسے مبارک سینے پر۔

فراق کی حالت میں میں اپنے معشوق کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ (اور اگر تو غور کرے تو) یہی راز ہے، میرے خوش و خرم اور اندوہ سے آزاد

(بقیہ صنہ ۱۶۰) ناز ہونا چاہیئے۔ میں نے اس کا مکمل دیوان بھی دیکھا ہے۔ اس شخص میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فلسفہ اور نفسیات کو شعر سے الگ نہیں ہونے دیتا۔ اس لحاظ سے اس کا انداز مرزا غالب سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ گوئٹے کی جو نظم میں نے یہاں پیش کی ہے۔ یہ بھی نفسیات اور فطرت انسانی کی بہترین ترجمان ہے اس کا اصل عنوان Im Gegenwärtigen Vergangenes واقع ہوا ہے۔ جو صاحب چاہیں اصل دیوان میں دیکھ سکتے ہیں۔

طارق

رہنے کا اور یہی ہے وہ جنت جس کا مقابلہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔ بن دیکھے معشوق کا آرزو مند رہنا، بظاہر کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو، لیکن تجھے کیا معلوم کہ یہی چیز بتیجہ کار ایک معصوم اور سچی فدائیت میں منتقل ہو جاتی ہے، اور یہی ہے وہ مقام جہاں شوق اپنی انتہائی عزت کو حاصل کر لیتا ہے!

اے دوست! بادل بھی اس سبک سیری اور برق رفتاری سے آسمانی بلندیوں میں نہیں تیر سکتا، جس سہولت اور جس بے تکلفی سے کہ میرا دل ہجر و فراق کی حالت میں اڑتا اور پرواز کرتا ہے اور اس طرح حسد یا رقابت کے جھگڑوں سے آزاد رہ کر اپنے محبوب سے پیار کرتا ہوں اور اس پیار میں اور کوئی بھی میرا شریک نہیں۔"

دعوتِ عمل یا فلسفۂ سخت کوشی

اس سلسلۂ گفتگو میں ہجر و فراق کے بعد "عمل" کا ذکر کرنا یہ مفہوم رکھتا ہے کہ مذکورہ احساس کے بغیر عمل کو کسی لحاظ سے تحریک ہی نہیں ہو سکتی، یہ ہجر کا غیر متناہی تصوّر اور جستجو کی بے نہایت پرواز ہے، جو انسان کو سرگرم عمل رکھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ فراق کی موجودگی، خواہ وہ کسی شکل میں ہو، کسی دنیوی مقصد کے زیر اثر ہو، عشق الٰہی کا رنگ رکھتی ہو، یا ایک جفا کار اور بے رحم معشوق کے اغماض سے پیدا شدہ ہو، قوائے جسمانی میں ہیجان، روح میں بیداری اور احساسات میں ایک بے پناہ ارتعاش پیدا کئے رکھتی ہے۔

گزشتہ عنوان میں توسٹیون سن کی بیان کی ہوئی مثالیں آپ نے ملاحظہ فرمائی تھیں۔ لیکن یہاں بھی آپ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ فرہاد شیریں کے زندہ ہوتے ہوئے اس کے فراق سے بے تاب ہوکر کیوں سرگرم تقاضا رہا، پہاڑ کیوں کاٹے، نہر کیوں کھودی، تیشہ کیوں اٹھایا، حد یہ ہے کہ اپنے رقیب خسرو کا محل تعمیر کرنے جیسی ذلت کیوں گوارا کرلی؟ اور پھر وہی شخص شیریں کی نسبت موت کی خبر پاکر آمادۂ خودکشی کس لئے ہوا؟ اس لئے اور محض اس لئے کہ پہلے ہجر کا احساس تھا جو رہ رہ کر وصال کی امید دلاتا تھا، اور اب اس جذبے کو تحریک دینے کے لئے کوئی وجہ نہ رہی تھی، خیر یہ تو ایک مثال تھی، آپ اسی پر جہانِ عمل کی تمام واردات کو قیاس فرما لیجئے۔ کائنات میں کوئی شے بھی اس قانون سے مستثنیٰ رہنے کا دعویٰ نہیں کرسکتی ہے

ذرّہ ذرّہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلےٰ آشنا

پس خلاصہ یہ ہوا کہ جہاں ہجر ہے، وہاں سب کچھ ہے اور جہاں یہ نہیں، وہاں کچھ بھی نہیں۔

اس بنا پر اب ہمیں عملی نگاہ سے ڈاکٹر صاحب کے اشعار پیش کرنا چاہئیں، کیونکہ عمل ہی سے ہر چیز وجود میں آتی ہے۔ عمل ہی سے زندہ رہتی ہے اور عمل ہی کو ترک کر دینے سے فنا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علّامہ اقبال نے اپنی شاعری کی بنا زیادہ تر عمل اور تلاش و جستجو ہی پر رکھی

ہے، وہ جتنا اس چیز پر زور دیتے ہیں کسی دوسری چیز پر نہیں دیتے۔ مثنوی "اسرار و رموز" کو دیکھئے یا "پیامِ مشرق" کا مطالعہ کیجئے۔ "زبورِ عجم" کو پڑھیئے یا "جاوید نامہ" پر نظر ڈالئے۔ غرضیکہ آپ کا فارسی کلام ہو یا اُردو، کون سی ایسی تصنیف اور اُس تصنیف کا کون سا ایسا شعر ہے، جس میں عمل کی تعلیم نہ دی گئی ہو، اور سچ پوچھو تو ڈاکٹر صاحب کا اصل زورِ بیان اور جوشِ طبیعت بھی اسی ایک موضوع سے ظاہر ہوتا ہے، گویا ایک دریائے ذخار ہے کہ اس کے اندر سینکڑوں تلاطم اُٹھتے ہیں اور ہر تلاطم کے ساتھ سینکڑوں اور ہزاروں موجیں ایک دوسری سے برسرِ پیکار ہیں اور اس جنگ میں کہیں چٹانوں سے اپنا سر پٹکتی ہیں اور کہیں ساحل کو دھکیلتی ہوئی نکل جاتی ہیں، غرض قرار و ثبات سے انہیں احتراز ہے اور اگر ایسا ہو تو یہی موت کا پیغام ہے۔

چنانچہ ذیل میں ہم اس موضوع پر جتنا بھی زیادہ ممکن ہو سکے گا، لکھیں گے، کیونکہ اگر ہم نے علامہ موصوف کے فلسفۂ عمل کو بھی تفصیلی رنگ میں قوم کے سامنے پیش نہ کیا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے کچھ بھی نہ کیا۔ لیکن قبل ازیں آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ڈاکٹر صاحب کے اس جوشِ عمل اور تلقینِ جستجو کا بڑا سبب مسلمانوں کی موجودہ بے حسی اور سکون و جمود ہے، جس نے انہیں موت کی گہری نیند میں سلا رکھا ہے، اس بے حسی اور قومی تنزل کا سبب یا تو یونانی حکیم افلاطون کا غلط نظریۂ حیات اور فلسفۂ گوسفندی ہے جس نے مسلمانوں پر ایک مرگِ خاموشی طاری کر دی، جاہل اور رہبانیت

پسند صوفیوں کی تعلیم ہے یا گزشتہ شاہانِ ہند کی وہ عیش پرستی ہے جس نے اسلامی شوکت کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے علاوہ فارسی اور اُردو میں بہت سے ایسے شاعر بھی گذرے ہیں جن کے کلام سے سوائے افسردگی اور مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اُن کے سینے امید اور یقین کے نور سے محروم ہیں، وہ ہمیشہ موت اور حسرت ہی کا ذکر کرتے ہیں، انہیں روحانی ترقی اور جذبۂ عشق کا کبھی احساس بھی نہیں ہوا، اول تو کمر کی نزاکت اور زلف کے پیچ وخم ہی سے انہیں کب نجات ملتی ہے اور اگر اتفاق سے کبھی ایسا ہو بھی جائے تو اپنے ضبط اور خودداری کا اظہار زیادہ سے زیادہ اس طور پر فرما دیتے ہیں کہ ؎

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

مولانا اکبر الہ آبادی ایک حسّاس اور زندہ دل شخص تھے، وہ غالباً اسی پر اپنے غم و رنج کا اظہار فرماتے ہیں ؎

اغیار تو دنیا میں اٹھائے ہوئے سر پر
ہم بیٹھے ہیں اس طرح کہ اٹھتا نہیں سر بھی
اغیار تو رگ رگ سے ہماری ہوئے واقف
ہم وہ ہیں کہ پاتے نہیں اس بُت کی کمر بھی

پھر علامہ اقبال نے ظہور کیا۔ تو اُن کے تدبّر نے زمانے کی ہوا کو قومی زندگی کے لئے مسموم پایا، اور سمجھ گئے کہ اِن حالات کے اندر بھی

اگر بے اعتنائی سے کام لیا گیا، تو یہ مریض جو آخری دموں تک پہنچ چکا ہے بالکل ہلاک ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کی غیرتِ ملی نے یہ ہرگز گوارا نہ کیا کہ اس کو یوں ہی چھوڑ دیں بلکہ اُٹھے اور اٹھ کر اپنے جاں نواز نغموں سے اس جسم مردہ کے اندر دوبارہ زندگی کی حرکت پیدا کی، آپ کے اس اقدام سے نہ صرف گذشتہ کمزوریوں ہی کی تلافی ہوئی، بلکہ اسلامی تصوف، اور قومی لٹریچر میں بھی ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا۔

اب ہم علامہ موصوف کے فلسفۂ عمل پر مختلف مقامات سے مثالیں پیش کرتے ہوئے اس حقیقت کو روشن کرتے ہیں۔ "رموز" میں لکھتے ہیں۔

اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ — جامِ تو فریادیِ بیدادِ سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا — سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرات را
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست — ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی ست
آزماید صاحبِ قلبِ سلیم — زورِ خود را از مہماتِ عظیم

عشق با دشوار ورزیدن خوش است | چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
خربۂ دوں ہمتاں کین است و بس | زندگی را ایں یک آئین است و بس
زندگانی قوت پیدا ستے | اصل او از ذوقِ استیلا ستے
عفوِ بے جا سردیٔ خونِ حیات | سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات
ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است | ناتوانی را قناعت خواندہ است

ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است[1]

یوں تو یہ سب کے سب اشعار اپنے اندر ہنگامہ اور جوش لئے ہوئے ہیں، لیکن میں آپ کی توجہ ایک نہایت ہی بلیغ شے کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ؎

عفوِ بے جا سردیٔ خونِ حیات
سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات

سچ پوچھئے تو اسی ایک شعر میں گویا قوموں کی تقدیر کو بند کر دیا گیا ہے، نہ صرف یہی بلکہ یہ چند الفاظ عظمت اور قوت کا پورا پورا سرمایہ رکھنے کے علاوہ ہر قسم کی سیاسی اور اجتماعی کمزوریوں کا حل پیش کر رہے ہیں، میں اس مقام پر نٹشے کے بیانات سے اس حقیقت کی توضیح کئے دیتا ہوں، وہ ایک جگہ اسی ضرورت کی رو سے خلاف "رحم" کی تردید کس قدر پُر زور الفاظ میں کرتا ہوں:۔

"آہ! کچھ نہ پوچھو کہ دنیا میں رحمدل لوگوں سے زیادہ بھی کوئی بیوقوف

---

[1] آبستن بمعنی حاملہ

یا کم فہم ہوگا۔ اور اس کا ذکر بھی نہ کرو کہ ان کی اس حماقت اور بزدلی نے دنیا کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔

افسوس ہے تمام ایسی مخلوق پر جو "رحم" جیسی ناکارہ اور محروم شے کے علاوہ اپنے لئے زندگی کا کوئی دوسرا سرمایہ نہ رکھتی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ شیطان جیسی بے رحم ہستی نے بھی مجھے ایک دفعہ ہنستے ہنستے یہ کہا۔ تجھے معلوم نہیں کہ وہ خدا جو دوسروں کو دوزخ میں جھونکنا چاہتا تھا، اکثر اوقات خود بھی ایک دوزخ کی نذر ہوگیا ہے، اور اس دوزخ نے اس کو سخت اذیت پہنچائی ہے؟ میں نے کہا کہ وہ دوزخ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ دوزخ انسانوں کی نسبت اس کی محبت اور عفوِ بے جا ہے۔ اور ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ میں کسی کی زبانی یہ خبر سن رہا تھا کہ "خدا فوت ہوگیا ہے، اس کا "رحم" اس کی موت کا واحد سبب تھا"[۱]

اب پڑھیئے اس شعر کو ؎

عفوِ بے جا سردیٔ خونِ حیات
سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات

نٹشے کے ان الفاظ سے آپ یہ ہرگز نہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ خدانخواستہ ہستی باری تعالیٰ کا منکر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسے سنگین پیرایہ میں ہمیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ اگر خدا اپنی صفت جلالی کو چھوڑ کر سراسر رحم اور شفقت کا پیکر بن جائے (اور یہ کبھی ممکن نہیں ہوسکتا) تو وہ بھی افسردگی اور خاموشی کے آثار محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ بالفاظِ دیگر قوانینِ الٰہیہ اور نظامِ دنیوی کا

---

[۱] خطبات زرتشت عنوان "رحمدل لوگ"

بیشتر عنصر قہر و غضب پر محتوی ہے۔ رحم، نرمی یا عفو بے جا پر ہرگز نہیں چنانچہ اس مفہوم کے لئے ہمارے پاس قرآن مجید کی صریح نص بھی موجود ہے۔

وَلکم فی القصاصِ حیات یا اولی الالباب

یعنی اے عقلمندو! قصاص اور بدلہ میں تمہارے لئے زندگی، اور زندگی کے ساتھ عزت ہے۔

اخلاقی حیثیت سے عفو و درگذر میں کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ پائی جاتی ہوں، لیکن استقلال ذاتی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو شان و شوکت، اور جو دبدبہ انتقام یا قصاص میں پایا جاتا ہے، وہ کہیں عفو و درگذر جیسی مردہ اور محروم صفات کو حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ تو ایک مجبوری کی صورت ہے جو کسی مجبور یا کمزور شخص ہی کی طرف سے اختیار کر لی گئی ہو۔ "خون کا بدلہ خون ہوگا"۔ اور پھر "اچھا چلو خدا کے لئے ہم نے معاف کر دیا"۔ اِن ہر دو جملوں کو پڑھیئے اور پھر انصاف سے فرمایئے کہ کیا اِن میں باہمی طور پر کوئی فرق نہیں، پہلا جملہ تو شکلاً اور معناً یہ کہہ کر رہا ہے کہ میں اس وقت حاکم ہوں، مختار ہوں اور اپنا انتقام لے کر چھوڑوں گا۔ حالانکہ دوسرے جملہ سے یاس و حسرت کے علاوہ اور کچھ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں خدائے تعالیٰ نے "قصاص" کو ایک افضل اور اعلیٰ شے قرار دیا، وہاں ہمیں قطعی طور پر اجازت دے دی کہ ہم چاہیں تو کان کا بدلہ کان۔ ناک کا بدلہ ناک۔ ہاتھ کا بدلہ ہاتھ۔ حتیٰ کہ سر کا بدلہ سر بھی لے سکتے ہیں۔ اور اس میں ہم پر کوئی گناہ نہیں۔

آپ کو اس جگہ یہ غلط فہمی لاحق نہیں ہونی چاہیئے کہ انتقام سے میری مراد جنگِ عظیم کا سا انتقام ہے جس نے ایک طور پر دنیا کا خاتمہ کر دیا، یا میں اس جگہ عربوں کے اُن ایامِ جاہلیت کو پیشِ نظر رکھے ہوئے ہوں۔ جبکہ وہ کفر اور غیر شعوری کی حالت میں ذرا ذرا سی بات پر قبیلے کے قبیلے کاٹ کر رکھ دیتے تھے اور معرکۂ کارزار ایک ایک صدی تک ختم ہونے میں نہیں آتا تھا ؎

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک اُن کی جہالت کا تھا وہ
کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جُو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یوں ہی روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یوں ہی چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

یہ انتقام نہیں، بلکہ زیادہ مناسب الفاظ میں ہم اسے ایک طرح کا

"ظلم وستم" یا" وحشت و بربریت" کہیں گے جس کی اجازت دنیا کا کوئی قانون نہیں دیتا۔

اسلام کے فیض سے مالا مال ہوکر بہت سے سلاطین نے عملی اور اخلاقی طور پر ہمیں" قصاص" اور" انتقام" کا صحیح مفہوم سمجھایا ہے جن میں سے دو ایک مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے نزدیک اُن سب سے نمایاں اور تعجب خیز مثال جہانگیر کی ہے کہ نور جہاں ایک دفعہ" غیرتِ حسن" سے مجبور ہوکر ایک آدمی کو ہلاک کر ڈالتی ہے اور اس جلد بازی پر بعد کو اُسے افسوس بھی ہوتا ہے، جہانگیر کے دل کی مالک اور خود ملکہ ہونے کی حیثیت سے اس کو حق تھا کہ اس خطا سے چشم پوشی اختیار کی جاتی، لیکن جہانگیر ان میں سے کسی شے کی پروانہ کرتے ہوئے قاضی کے فتوئی پر ورثا کو نور جہاں کا سر اور جلاد کی شمشیر سونپ دیتا ہے جس پر انتہائی کشمکش کے بعد خود اس کے وزرا اور درباری لوگ اُن ورثا کی منت سماجت کر کے انہیں خوں بہا قبول کر لینے پر رضامند کر لیتے ہیں اور یوں ایک ملکۂ حُسن کی جان بخشی ہوتی ہے۔ مولانا شبلی نے تاریخ کے اس زریں واقعہ کو نظم بھی کیا ہے۔ وہ نظم حسب ذیل ہے:-

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن نور جہاں بام پر تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہگیر اُدھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن[۱]

۱؎ قدغن۔ پہرہ

غیرتِ حُسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہِ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ سے آگئی ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جاکے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوتِ حُسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشورِ حُسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن

مفتیٔ دین سے جہانگیر نے فتوےٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتیٔ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اُڑا دو گردن

لوگ دربار میں اس حکم سے تھرّا اُٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
پھر اُسی طرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلّاد کو دیں حکم کہ "ہاں تیغ بزن"

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن
اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھرّاتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بے کس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

لہ نازو انداز

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن
مفتیِ شرع سے پھر شاہ نے فتوے پوچھا
بولے جائز ہے، رضامند ہوں گر بچہ و زن
وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کی "اے شاہِ زمن"
ہم کو مقتول کا لینا نہیں مقصود قصاص
قتل کا حکم جو رُک جائے تو ہے مستحسن
ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبہ حیلہ و فن
اُٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکفِ بیت حزن
دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
"تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من!"

اللہ! اللہ! کیا یہ معمولی بات ہے کہ ایک بادشاہ قصاص اور انتقام کی ترجیح ثابت کرنے کے لئے اپنی محبت کو کچل ڈالے اور نہ صرف محبت ہی کو کچلے، بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی زندگی کا تباہ ہونا بھی گوارا کر لے وہ چاہتا تو بہت سے جابر سلاطین کی پیروی بھی کر سکتا تھا، جو ایک طرف اگر کسی خونِ ناحق کی پروا نہیں کرتے، تو دوسری جانب کسی کے حرفِ شکایت زبان پر لاتے ہی اُسے بھی تہ تیغ کر دیا کرتے ہیں۔

دوسرا واقعہ حال ہی میں ابنِ سعود شاہِ حجاز کا ہے، جس نے اپنے بیٹے کو اس لئے قتل کروا دینا چاہا تھا کہ غلطی سے ایک بدّو اس کی موٹر کے نیچے آکر مر گیا، اعلیٰ حضرت نے اس پر اصرار کیا کہ اُن کے بیٹے سے ضرور اس خون کا بدلہ لیا جائے اور اس کے ورثا کو مالی صورت میں اس کا بدلہ لینے کی کوئی ترغیب نہ دلائی جائے، بالآخر یہ ہوا کہ ان لوگوں نے خود شہزادہ کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاوضہ قبول کر لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ یہ شہادت اس امر کی ہے کہ ؎

عفوِ بے جا سردیٔ خونِ حیات
سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا مطالبہ ہے کہ ایک پختہ کار انسان میں "قوتِ تخلیق" کا پایا جانا نہایت ضروری ہے، ورنہ کم از کم "قوتِ تخریب" تو ہو یعنی اول تو زندگی کے تمام عناصر کو اس کا مغلوب اور مقہور ہونا چاہیئے۔ اور اگر اتفاق سے ایسا نہ ہو تو وہ اپنے اندر یہ صلاحیت رکھے کہ پرانے نظام کو درہم برہم کر کے زمانے کا رُخ اور حالات کی کایا اپنے حسبِ منشا پلٹ سکتا ہو، چنانچہ ان اشعار کو ایک دفعہ پھر غور سے دیکھیے۔

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرّات را

سچ کہا ہے کہ ایک اندھے اور کم ظرف انسان کو اپنی قوت آزمائی

کے لئے صرف یہی ایک جہاں دکھائی دیتا ہے حالانکہ درپردہ ایسی بیسیوں دنیائیں اس کی قوتِ تسخیر اور جودتِ طبع کو کھڑی ہوئی دعوت دے رہی ہیں ؎

یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید!
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیِ فکر و کردار کا

اب نظامِ عمل کے یہ عام اصول ذکر کر چکنے کے بعد خاص طور پر ان لوگوں کو مخاطب فرماتے ہیں، جو رہبانیت یا گوشہ گیری کو

زندگی اور عمل کا فلسفہ قرار دیئے ہوئے ہیں ؎

اے کہ از تاثیر افیوں خفتۂ
عالم اسباب را دوں گفتۂ

خیز و واکن دیدۂ مخمور را
دوں مخواں ایں عالم مجبور را

حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد
جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد

نائبِ حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود

دست رنگیں کن زخونِ کوہسار
جوئے آبِ گوہر از دریا برآر

جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن

غنچۂ؟ از خود چمن تعمیر کن
شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن

یعنی اپنے ناچیز اور بے بود ہونے کے خوف سے خود کو زمانے کے حوالے نہ کر دے، بلکہ زمانے کو اپنی سخت کوشی اور استقلال سے مسخر کر۔

اسی طرح "اسرارِ خودی" میں ایک حکایت "الماس و زغال" کے عنوان سے پیش کی گئی ہے، اس میں کوئلہ الماس سے دریافت کرتا ہے کہ اصل تو ہم دونوں کی ایک ہے۔ پھر یہ کیا وجہ ہے کہ تو شاہوں کے تاج میں جگہ حاصل کرتا ہے اور میں انگیٹھی ہی میں پڑا جلتا ہوں۔ تیری قدر ہوتی ہے اور میں ہر جگہ ذلیل ہوں، اس پر الماس جو کچھ جواب دیتا ہے وہ فلسفۂ سخت کوشی کی بہترین تشریح ہے۔ ہم وہ چند اشعار یہاں نقل کرتے ہیں ؎

گفت الماس اے رفیقِ نکتہ بیں
تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں

تا بہ پیرامونِ خود در جنگ شد
پختہ از پیکار مثلِ سنگ شد

پیکرم از پختگی ذوالنور شد
سینہ ام از جلوہا معمور شد

خوار گشتی از وجودِ خام خویش سوختی از نرمیٔ اندامِ خویش
فارغ از خوف و غم و وسواس باش پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش
می شود از وے دو عالم مستنیر ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
مشتِ خاکے اصلِ سنگِ اسود[1] است کہ سر از جیبِ حرم بیرون زد است
رتبہ اش از طور بالاتر شد است بوسہ گاہِ اسود و احمر شد است
در صلابت[2] آبروئے زندگی است
ناتوانی، ناکسی ناپختگی است

اس ضمن میں "پیامِ مشرق" کی بھی چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں یہاں بھی سخت کوشی اور جفا طلبی ہی کی تعلیم دی گئی ہے. فرماتے ہیں ؎

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے
تنے محکم تر از سنگین حصارے
درونِ او دلِ دردآشنائے
چو جوئے در کنارِ کوہسارے

ندی جب کوہستانی علاقوں میں سے ہوتی ہوئی گذرتی ہے، تو اس کا جوش و خروش معمول سے بڑھ جایا کرتا ہے، اسی کیفیت کے پیشِ نظر اس کو دلِ دردآشنا سے تعبیر کیا گیا ہے، جو موقع اور مقام کے لحاظ سے ایک نہایت لطیف اور نادر تشبیہ ہے.

---

[1] وہ سیاہ رنگ کا پتھر جو حرم کعبہ میں آویزاں ہے [2] پختہ اور ٹھوس ہونا.

اسی مفہوم کی تشریح کرتی ہوئی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، یہاں بھی اسی جنگ آزمائی کی تلقین کی گئی ہے ؎

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت　　شریکِ سوز و ساز بحر و بر شو
تو این جنگ از کنارِ عرصہ بینی　　بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

اس طرح ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا　　ہوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز　　حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اللہ، اللہ! اس سے بڑھ کر جوشِ عمل اور کیا ہوگا ؎

ز قید و صید نہنگاں حکایتے آور
مگو کہ زورقِ ما آشنائے دریا نیست

حیات قومی کے لئے ایسے ہی دلیرانہ اقدام کی ضرورت ہے، زندگی اس وقت خطرات کے اندر ہے، یہاں نتائج سے بالکل بے نیاز ہو جانا چاہیئے ؎

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

یہ عمل ہی کی سرگرمیاں اور سخت کوشی ہی کی لذتیں ہیں کہ اپنے لئے راستہ بھی صاف اور سیدھا پسند نہیں فرماتے ہیں کہ اس میں وہ لطف کہاں جو پیچیدہ اور ناہموار راستہ طے کرنے سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

خیال او درون سینہ خوشتر　　غمش افزودہ جاں کاہیدہ خوشتر
مرا صاحبدلے این نکتہ آموخت　　ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

دوسری جگہ لکھتے ہیں ؎

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ پُرخطر است

اسی طرح ؎

وائے آں قافلہ کز دونیٔ ہمت میخواست
رہگذارے کہ درو ہیچ خطر پیدا ست

یعنی پُرخطر اور دشوار راستے کا نہ چاہنا بھی پست ہمتی کی دلیل ہے۔
زبورِ عجم کا ایک شعر ہے ؎

غلط خرامیٔ ما نیز لذّتے دارد
خوشم کہ منزلِ ما دور و راہ خم بخم است

مرزا غالبؔ نے بھی جفا طلبی کے اس مضمون کو اپنے رنگ میں باندھا ہے، یہ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کہتا ہے کہ میں تو پہلی تکلیفوں ہی سے گھبرا اٹھا تھا، لیکن بھلا ہو ان درپیش آنے والی مصیبتوں کا یہ اپنی انتہائی لذّت سے میرے ناتمام احساس کو محو کر ڈالیں گی اور اس طرح میں زندگی کی حقیقی راحت حاصل کر سکوں گا۔

خیر یہ تو تشریحِ مطالب کے طور پر ایک ضمنی چیز تھی، اس کے بعد

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ زندگی کی تجدید صرف عمل ہی سے ممکن ہو سکتی ہے، ہم بھی اسی وقت تک قائم ہیں، جب تک ہمارے دلوں میں جذبۂ عمل موجود ہے ورنہ اس کے بغیر ہمارا زندہ رہنا ایک امر محال ہے ؎

چہ پرسی از کجایم چیستم من　　بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موجِ بیقرارم　　اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

اس حقیقت کو دوسری جگہ یوں واضح فرمایا ہے ؎

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ معلوم نشد آہ کہ من چیستم
موجِ زخود رفتہ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نروم نیستم

ایک اور شعر ہے ؎

زندگی رہرواں در تگ و تاز است و بس
قافلۂ موج را جادہ و منزل کجاست

اسی مفہوم کو اکبر مرحوم کی سہل اور دل آویز زبان میں ملاحظہ فرمانا ہو تو ذیل کے چند اشعار پڑھ جایئے۔ انداز کی جدت اور معانی کی نزاکت دونوں قندِ مکرر کا مزا دے رہے ہیں ؎

دور کوہ لبِ ساحل سے جو گذری اک موج
کوہ نے اُس سے کہا تو نے نہ دیکھا مرا اوج
مجھ سے مل کر تجھے جانا تھا برائے دم چند
بولی سالک کبھی کرتے نہیں ساکن کو پسند

ہیں بڑے آپ مگر اپنی جگہ سے ہیں اٹل
اپنی رفتار میں کیا فائدہ ڈالوں میں خلل
ہنس کے اس بحث پہ بولا کسی جانب سے حباب
پوچھئے موج سے ہے بھی اسے رُک جانے کی تاب
اپنے بس ہی میں نہیں ہے یہ تعلّی کیسی
اضطراری ہے روش شانِ ارادی کیسی
بہ گئی موج یہ کہہ کر کہ میں مغرور نہیں
تجھ میں اے کوہ مگر روشنیٔ طور نہیں
بُلبُلا ٹوٹ گیا کوہ بھی خاموش رہا
وہی حیرت رہی دریا کا وہی جوش رہا

پھر ذوقِ عمل کی انتہا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جنت کی پُرسکون زندگی کو بھی انسانی عزم وہمت کے خلاف سمجھتے ہوئے اس کی نفی فرمادیتے ہیں۔

چو در جنت خرامیدم پس از مرگ — بچشمم ایں زمین و آسماں بود
شکے باجانِ حیرانم در آویخت — جہاں بود آں کہ تصویرِ جہاں بود

اس جگہ رباعی کا مفہوم سمجھنے سے پہلے چوتھے مصرع کی بلاغت اور ادا بہت خاص طور پر ہمیں اپنا گرویدہ بنالیتی ہے، ایک غیر متحرک اور پرسکون دنیا کو دیکھ کر یہ کہنا کہ ؎

جہاں بود آں کہ تصویرِ جہاں بود

حسنِ بیان اور حسنِ انداز کی انتہا ہے، اسی انداز پر ایک تشبیہ

"بانگ درا" کی نظم "خضرِ راہ" میں بھی پائی گئی، اور وہ یہ کہ ؎

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ "دریا ہے یا تصویرِ آب"

بہرکیف شاعر کا مقصد یہ ہے کہ جس نے یہاں کے ہنگامے دیکھے ہوں، اُس کا دل جنت کی خاموش اور غیر متحرک زندگی سے کیونکر مانوس ہوسکتا ہے؟ جہاں نیکی اور بدی کی باہمی جنگ نہ ہو، اور عمل کے جذبات فروغ حاصل نہ کرسکیں، وہ دنیا بھی کوئی دنیا ہے؟ چنانچہ دوسری جگہ تو صاف لفظوں میں فرما دیا کہ ؎

مزی اندر جہانِ کور ذوقے   کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

ان تاثرات کی رُو سے "بالِ جبریل" کا ایک مکالمہ اپنے اندر کس قدر دلچسپی لئے ہوئے ہے، اس میں جبریل ابلیس سے سوال کرتا ہے ؎

جبریل: ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟
ابلیس: سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے و آرزو
جبریل: ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟
ابلیس: آہ! اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ وکو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا؟

جبریل: کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

ابلیس: ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفان یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو . اللہ ہو اللہ ہو

اور کیا اس ضمن میں آپ کو ابلیس کا وہ نوحہ یاد نہیں، جسے "جاوید نامہ" میں ذکر کیا گیا ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ جس دنیا میں آدم کی فطری قوتیں اور امکاناتِ زندگی رونما ہو سکتی ہوں، وہ یہی دنیا ہے جس میں ہم

اس وقت آباد ہیں، لیکن یہ بات الگ ہے کہ انسان اپنی غفلت اور کجروی سے اس میدانِ کارزار کی رونق اور آبادی کو کھو دے چنانچہ اس نظم کو بغور ملاحظہ فرمائیے کہ یہ بھی ایک طور پر ہمارے لئے دعوتِ عمل ہے۔

اے خداوندِ صواب و ناصواب — من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوقِ ابا بیگانۂ — از شرارِ کبریا بیگانۂ
صید خود صیاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ فرماں پذیر
از چنیں صیدے مرا آزاد کن — طاعتِ دیروزۂ من یاد کن
پست ازو آں ہمتِ والائے من — وائے من اے وائے من اے وائے من
فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف — تابِ یک ضربم نیارد ایں حریف
بندۂ صاحب نظر باید مرا — یک حریفِ پختہ تر باید مرا
لعبتِ آب و گل از من باز گیر — می نیاید کودکی از مردِ پیر
ابنِ آدم چیست یک مشتِ خس است — مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود — ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود
شیشہ را بگداختن عارے بود — سنگ را بگداختن کارے بود
آنچناں تنگ از فتوحات آمدم — پیشِ تو بہرِ مکافات آمدم
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ — سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم — لرزہ اندازد نگاہش در تنم
آں کہ گوید از حضورِ من برو — آں کہ پیشِ او نیرزم با دو جو

اے خدا یک زندہ مردے حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست

اس مفہوم کے ماتحت دوسری جگہ پھر عمل کی ضرورت کو ظاہر فراتے ہوتے لکھتے ہیں ؎

تراش از تیشۂ خود جادہ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اس سے زیادہ غیرت اور خودداری کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے۔ کوششِ عمل کی اسی لذت کو ظاہر کرتا ہوا ایک اور شعر ہے ؎

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا عیش برو آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

یعنی زندگی کی سچی راحت ہر حالت میں صرف ذاتی کوشش اور جستجو ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، دوسروں کے بھروسے پر رہنا جوانوں کا شیوہ نہیں، تو گویا ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردئ ہمسایہ در بہشت

اس جگہ نٹشے کے تاثرات بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ کس خوبی سے اور کن کن عمدہ مثالوں کے ساتھ اس مفہوم کو واضح کرتا ہے

۰ اگر تم کسی بلند مقام پر پہنچنا چاہتے ہو، تو اس کے لئے فقط اپنی ٹانگوں کو استعمال میں لاؤ، ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا شخص تمہیں اٹھا کر وہاں تک لے جائے اور نہ ہی یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے فائدے کے لئے اوروں کے سر، یا ان کی پیٹھ پر سوار ہو بیٹھو!

اچھا، کیا تم ایک گھوڑے پر سوار ہو گئے ہو اور کیا اب تم انتہائی سرعت کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ بہت اچھا، ایسا ہی سہی جس طرح جی چاہے سواری کرو، لیکن اس سواری کی شیخی میں اتنا یاد رہے کہ جہاں تم گھوڑے کی پیٹھ پر بالکل اپاہج بنے بیٹھے ہو، وہاں جب تم اس انتہائی بلندی پر پہنچ لو گے، جو تمہاری منزلِ مقصود ہے اور گھوڑے سے نیچے اترو گے، وہیں تمہاری سُن اور بے کار ٹانگیں تمہیں دھڑام سے نیچے گرا دیں گی اور اس طرح سے آن واحد میں تمہارا خاتمہ ہو جاتے گا۔

اس لئے میرے محترم بھائیو! اپنے دلوں اور ارادوں کو جتنا چاہے بلند کرو، لیکن ساتھ ہی اپنی ٹانگوں کو فراموش نہ کر دو، انہیں بھی اپنے ساتھ ہی اٹھنے اور پرواز کرنے کا موقع دو اور اس طرح سے اپنے مقصد کی طرف خوشی خوشی رقص کرتے ہوئے بڑھتے چلے جاؤ، بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ تم اپنے سرِ دل پر آپ سوار ہو جاؤ، یعنی تمہاری سواری فقط تمہاری اپنی ذات ہونی چاہیئے۔

اس لحاظ سے تم اُس ہوا کی پیروی اختیار کرو جو اپنے نشیمن، یعنی پہاڑ کے غاروں سے دیوانہ وار حملہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے، اس کا رقص کرنا اس کی

بتسری ہی پر موقوف ہے، وہ جب اپنے دہشتناک اور وسیع بازوؤں سے سمندر کی جانب پرواز کرتی ہے، تو وہ اسے دیکھ کر خوف وہراس کے ساتھ کانپنے اور تھر تھرانے لگتا ہے اور اس طرح سے آگے بڑھ بڑھ کر اس کے قدموں کو چومتا اور سہلاتا ہے"۔ ؎۱

بلندیٔ مقاصد کے اسی فلسفے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب بھی فرماتے ہیں ؎

قبائے زندگانی چاک تا کے
چو موراں آشیاں در خاک تا کے
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز
تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے

"بالِ جبریل" میں چیونٹی عقاب سے سوال کرتی ہے ؎

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب اس کا جواب دیتا ہے ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

یہی مضمون دوسری جگہ ؎

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی

؎۱ خطبات زرتشت۔ عنوان "رفیع المرتبہ انسان"

لیکن اگر اس کے خلاف کیا جائے اور ناجائز قناعت اختیار کرتے ہوئے گوشہ گیری کو ترجیح دے لی جائے، تو اس کا جو نتیجہ ہوگا۔ وہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے ؎

تنش از سایۂ بال تدروے لرزہ می گیرد
چو شاہیں زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد

الغرض ؎

جرّہ شاہینی بمرغانِ سرا صحبت مگیر
خیزد بال و پر کشا پروازِ تو کوتاہ نیست

"صحبت" کا اثر کس قدر قوی ہوتا ہے، غالب اقوام مغلوب قوموں کے امتزاج سے کیونکر اپنا عروج کھو بیٹھتی ہے اور شیروں کے حوصلے بھی خلافِ طبیعت جگہ اور خلافِ طبیعت ماحول میں رہ کر کس طرح پست ہو جاتے ہیں اور کس طرح وہ اپنی خوئے شیری کو بر کنار رکھتے ہوئے مسالمت گوسفندی اختیار کر لیتے ہیں ؟ یہ تمام باتیں نفسیات سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہیں اور جذبات آپس کے عمل اور ردِ عمل سے ایک دوسرے کو جذب و ہضم کرتے رہتے ہیں۔ اگر آپ ایک عطّار کے یہاں جا بیٹھیں تو لازمی طور پر آپ کو خوشبو آتی رہے گی، لیکن اگر آپ وہیں سے اُٹھ کر کسی لوہار کے یہاں چلے جائیں، تو نہ صرف دھوئیں ہی سے آپ کی طبیعت پریشان ہونے لگے گی، بلکہ وہاں کی چنگاریاں بھی اڑ اڑ کر آپ کے کپڑوں کو اکثر جگہ سے چھلنی کر ڈالیں گی۔

لہ مکور

ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے اور "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" بالکل آزمائی ہوئی باتیں ہیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اسی خیال کو کہ بزدل لوگوں کی صحبت سے بہادر لوگ بھی بزدل بن جایا کرتے ہیں "مثنوی اسرارِ خودی" میں بطورِ حکایت بیان کیا ہے اور وہ حکایت یہ ہے ؎

آں شنیدستی کہ در عہدِ قدیم
گوسفنداں در علف زارے مقیم

از وفورِ کاہ نسل افزا بدند
فارغ از اندیشۂ اعدا بدند

آخر از ناسازیٔ تقدیرِ میش
گشت از تیرِ بلائے سینہ ریش

شیرہا از بیشہ سر بر زدند
بر حصارِ گوسفنداں تاختند

جذب و استیلا شعارِ قوت است
فتح رازِ آشکارِ قوت است

شیرِ نر کوسِ شہنشاہی نواخت
میش را از حرّیت محروم ساخت

بسکہ از شیراں نیاید جز شکار
سرخ شد از خونِ میش آں مرغزار

گوسفندے زیرکے فہمیدۂ
کہنہ سالے گرگ باراں دیدۂ

تنگ دل از روزگارِ قومِ خویش
از ستم ہائے ہژبراں سینہ ریش
شکوہ ہا از گردشِ تقدیر کرد
کارِ خود را محکم از تدبیر کرد
بر حفظِ خویش مردِ ناتواں
حیلہ ہا جوید ز عقلِ کارداں
در غلامی از پئے دفعِ ضرر
قوتِ تدبیر گردد تیز تر
پختہ چوں گردد جنونِ انتقام
فتنہ اندیشی کند عقلِ غلام
گفت با خود عقدۂ ما مشکل است
قلزمِ غمہائے ما بے ساحل است
میش نتواند بزور از شیر رست
سیم ساعد ما و او پولاد دست
نیست ممکن کز کمالِ وعظ و پند
خوئے گرگی آفریند گوسفند
شیر نر را میش کردن ممکن است
غافلش از خویش کردن ممکن است

صاحبِ آوازۂ الہام گشت
واعظِ شیرانِ خون آشام گشت

نعره زد ای قوم کذاب اشر
بی‌خبر از یوم نحس مستمر[۱]
مایه‌دار از قوت روحانیم
بهر شیران مرسل یزدانیم
دیدهٔ بی نور را نور آمدم
صاحب دستور و مامور آمدم
توبه از اعمال نامحمود کن
ای زیان اندیش فکر سود کن
هر که باشد تند و زور آور شقی است
زندگی مستحکم از نفی خودی است
روح نیکان از علف یابد غذا
تارک[۲] اللحم است مقبول خدا
تیزی دندان ترا رسوا کند
دیدهٔ ادراک را اعمی[۳] کند
جنت از بهر ضعیفان است و بس
قوت از اسباب خسران[۴] است و بس
جستجوی عظمت و سطوت شر است
تنگ دستی از امارت خوشتر است

---

۱ یہاں سے راہبانہ انداز کا وعظ شروع ہوتا ہے۔ ۲ گوشت کا تارک ۳ اندھا ۴ گھاٹا۔ نقصان

برق سوزاں در کمینِ دانہ نیست
دانہ گر خرمن شود فرزانہ نیست
ذرّہ شو صحرا مشو گر عاقلی
تا ز نورِ آفتابے برخوری
اے کہ می نازی بذبح گوسفند
ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند
زندگی را می کند ناپائدار
جبر و قہر و انتقام و اقتدار
سبزہ پامال است و روید بار بار
خوابِ مرگ از دیدہ شوید بار بار
غافل از خود شو اگر فرزانۂ
گر ز خود غافل نۂ دیوانۂ
چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
تا رسد فکرِ تو بر چرخ بلند
ایں علف زارِ جہاں ہیچ است ہیچ
تو بریں موہوم اے ناداں مپیچ
خیلِ شیر از سخت کوشی خستہ بود
دل بذوقِ تن پرستی بستہ بود
آمدش ایں پند از خواب آور پسند
خورد از خامی فسونِ گوسفند

آنکہ کردے گوسفنداں را شکار
کرد دینِ گوسفندی اختیار
با پلنگاں سازگار آمد علف
گشت آخر گوہرِ شیری خزف
از علف آں تیزیٔ دنداں نماند
ہیبتِ چشمِ شرار افشاں نماند
دل بتدریج از میانِ سینہ رفت
جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
آں جنونِ کوششِ کامل نماند
آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت
اعتبار و عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنیں بے زور شد
مردہ شد دلہا و تنہا گور شد
زورِ تن کاہید و خوفِ جاں فزود
خوفِ جاں سرمایۂ ہمت ربود
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی
کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی
شیر بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

ؔ روحانی اور جسمانی تنزل

نٹشے بھی صحبت اور مجالست کے انہیں مہلک خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اے دوست! تاخیر نہ کر اور جلدی سے اس بلند اور پاکیزہ ہوا میں اڑ جا۔ جو تیرے لئے نہایت صحت بخش ثابت ہوگی اور جہاں تجھے اپنی صحبت کے لئے بجائے زاغ و زغن کے باز اور شکرے میسر آئیں گے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اس پستی میں رہ کر یہاں کی زہریلی مکھیوں (بدطینت اور افسردہ لوگوں) نے تجھے ہر طرف سے کاٹ کھایا ہے اور یہ زہر تیرے حق میں مہلک ثابت ہوگا۔ یہ ہوا تجھے سازگار نہیں۔ اس لئے تاخیر نہ کر اور جلدی سے اپنی مناسب جگہ کی طرف پرواز کر جا۔" ؎

اس کے بعد پھر ڈاکٹر صاحب آرام طلبی سے منع کرتے اور آمادۂ عمل ہونے کی تلقین فرماتے ہیں سے

اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل بر خیز
کہ ترا کار بہ گرداب و نہنگ است ہنوز
از سرِ تیشہ گذشتن ز خرد مندی نیست
اے بسا لعل کہ اندر دلِ سنگ است ہنوز

ان اشعار میں جس شان سے تنبیہ کی گئی ہے وہ اہلِ نظر حضرات پر ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ عمل کی ترغیب بھی ان سے زیادہ مؤثر اور بہتر الفاظ میں نہیں دلائی جا سکتی۔ پس اسی مفہوم کے پیش نظر دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

؎ خطبات زرتشت۔ عنوان "مارکیٹ کی مکھیاں"

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و تیر بیگانہ سازد مردِ غازی را

الغرض سکون و جمود ہر حالت میں مذموم ہے اور زندگی کی امکانی قوتیں عمل اور صرف عمل ہی میں پوشیدہ ہیں، اس لئے تاکید بھی بار بار اسی کے لئے کی جاتی ہے ؎

بر کشت و خیاباں پیچ بر کوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بسحاب اندر

اللہ، اللہ! ہمت کی بلند پروازیاں بھی ملاحظہ ہوں ؎

غلامِ ہمتِ بیدار آں سوارانم
ستارہ را بسناں سفتہ در گرہ بستند

اور پھر ؎

نگردد زندگانی خستہ از کارِ جہانگیری
جہانے در گرہ بستم جہانے دیگرے پیش است

حسنِ تشبیہ کے علاوہ جستجو کی بے تابی ملاحظہ ہو ؎

سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوئے تو
راہ چو مار می گزد گر نہ روم بسوئے تو

اس شعر میں راہ کو پیچ در پیچ ہونے کی وجہ سے سانپ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

علامہ اقبال کا یہ شعر زورِ بیان اور جوشِ عمل کی بہترین مثال ہے۔

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں

اسی ضمن میں یہ بلیغ شعر بھی ملاحظہ ہو ؂

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

یعنی انسان کو ہمت اور کوشش سے اپنی زندگی کے اندر یہ شان پیدا کرنی چاہیئے کہ اگر بالفرض خدا نے ہماری موت کو ایک ہمیشہ کی موت قرار دیا ہے، تو وہ بھی ہماری اِن امکانی قوتوں کو دیکھ کر نادم ہو جائے کہ میں نے ایک ایسی ہستی کو جو اپنے قوائے فطریہ کی مدد سے فرشتوں پر بھی فائق ہے، ہمیشہ کی موت میں کس لئے مبتلا کیا، اسی مفہوم اور اسی انداز میں "بالِ جبریل" کا یہ شعر کس قدر شاندار ہے ؂

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ہمت کی یہی بلندی اور عزم کا یہی استحکام ہے جس کو دوسری جگہ یوں ظاہر فرمایا ہے ؂

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

پھر زندگی کے ساتھ جس سخت کوشی اور استقلال کی ضرورت ہوا کرتی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہوگا۔ فرماتے ہیں ؂

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

اور پھر جب تک مٹی کا یہی پیکر عشق کے سوز سے خالی ہے، زندگی اپنے حقیقی لباس میں جلوہ نما نہیں ہو سکتی، اس کا استقلال فقط یقین اور بیداریٔ روح پر منحصر ہے ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

اس کے بعد پھر ارتقائے حیات اور حفظِ خودی کی تعلیم ہے ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

اسی طرح ایک اور شعر ہے ؎

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر

ایک پست ہمت اور مردہ دل شخص کی حوصلہ افزائی ان سے بہتر الفاظ میں اور کون کر سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر تیرے ضعفِ اعتقاد اور خوف وہراس نے تجھے پامال کر رکھا ہے۔ تو کوشش اور سعی سے یہی پستی تیرے انتہائی عروج کا زینہ بن جائے گی۔ "بالِ جبریل" کے چند اشعار ہیں ؎

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سالخوردہ
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ان تمام بیانات سے آپ کو اس حقیقت کا اندازہ تو بخوبی ہو گیا ہوگا کہ عملی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی اصل تعلیم ہر حالت میں یہی ہے کہ ؏

"حیاتِ جاوداں اندر ستیز است"

گویا وہ ہمیشہ کے لئے ہمیں مصروفِ پیکار دیکھنا چاہتے ہیں، ان مقاصد کے زیرِ اثر اس جگہ نٹشے کے ہنگامہ خیز تاثرات سے بھی مسامحت اختیار نہیں کی جا سکتی، کیونکہ یہاں بھی اُس کے بیانات سونے پر سہاگے کا کام دے رہے

ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"میں تمہیں صرف مصروفِ کار ہی دیکھنا نہیں چاہتا، بلکہ میرا منشا یہ ہے کہ تم زمانے کے ساتھ جنگ آزمائی کرو اور پھر میں تمہیں یہ بھی ہرگز نہیں کہتا کہ تمہاری اس جنگ کا نتیجہ صلح یا آشتی ہو، بلکہ میری آرزو یہ ہے کہ اس کا نتیجہ محض فتح وظفر ہونا چاہیئے۔

تم کیوں ایسے مضبوط اور توانا نہیں بن جاتے کہ تمہارا کام تمہاری جنگ آزمائی کے مرادف ہو اور تمہاری صلح اپنے اندر فتح ونصرت کا مفہوم رکھے۔

جس شخص کے بازو میں خدا نے قوت بھی رکھی ہو اور اُس کے پاس تیر وکمان بھی ہو، اس کے لئے تو یہ مناسب ہی نہیں کہ وہ خاموشی کے ساتھ بیٹھ رہے۔ یہ ایک ناممکن بات ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ ان ہتھیاروں کی عدم موجودگی میں وہ اپنی جنگ آزما فطرت سے مجبور ہو کر شدّت سے باتیں کرے گا اور پھر ان باتوں میں خواہ مخواہ اپنے لئے لڑائی کی راہ نکالے گا، پس تم کیوں ایسا نہیں کرتے کہ تمہاری "صلح" ہر حالت میں تمہاری "فتح" ہو"۔ [1]

اس طرح ایک دوسری جگہ کہتا ہے:۔

"میں لڑتا بھڑتا اپنی منزلِ مقصود کی جانب بڑھتا چلا جاتا ہوں اور اس رستہ میں کسی قسم کے خطرے کی پروا نہیں کرتا، اس طرح سے میں اُن تمام سوچ بچار کرنے والے بزدل لوگوں کو پھاند کر نکل جاؤں گا۔ جو اپنے مقصد کی تکمیل میں تاخیر کرتے ہیں، اس شورش اور جنگ آزمائی میں اگر وہ میرے پاؤں کے

---

[1] خطباتِ زرتشت۔ عنوان "جنگ اور جنگجو"

نیچے کچل کر فنا بھی ہو جائیں تو مجھے اس کی مطلق پروا نہیں، چیونٹیوں اور کیڑوں مکوڑوں کا ہمیشہ یہی انجام ہوا کرتا ہے!

اس کے عمل کی نسبت مذکورہ بالا اوصاف کے لئے انسانی شرف و فضل کا جاننا نہایت ضروری ہے، ورنہ اس کے بغیر عزتِ نفس کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکے گا۔ اور اگر یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ چنانچہ "پیامِ مشرق" میں انسان کی عظمت کو اس طور پر ظاہر کیا گیا ہے ؎

ضمیرِ کن فکاں غیر از تو کس نیست
نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بے باک تر نہ در رہِ زیست
بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

اور پھر ؎

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر
کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

"ابتدائے عالم سے لے کر اب تک انسان کے حق میں یہ کس قدر شرمناک بات ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی کہیں سورج کو اپنا دیوتا تسلیم کر کے اس کے سامنے جھک جاتا ہے، کہیں وہ چاند اور ستاروں کے سامنے سرنگوں ہے، کہیں اس نے شجر و حجر کو اپنا معبود قرار دے لیا ہوا ہے، کہیں وہ اپنے جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے انسانوں کی پرستش کرنے لگتا ہے، کہیں آگ سے خوف زدہ ہے، تو کہیں دریاؤں کو خدا سمجھے بیٹھا

ہے، فی الحقیقت انسان کی یہی افسوسناک گمراہی اور "خودی" کا یہی ناقابل تلافی نقصان ہے جس کے لئے دنیا میں پے در پے پیغمبر آتے رہے، بے شمار آسمانی کتابیں نازل ہوئیں اور انہوں نے بتلایا کہ اے انسان! تیرے لئے محض "انسان" ہونا ہی ایک ایسی فضیلت ہے جو تجھے تمام کائنات سے بے نیاز کر دیتی ہے، تمام دوسری چیزیں ایک طور پر تیری عابد ہیں اور تو ان کا معبود، وہ تیری محکوم ہیں اور تو ان کا حاکم، وہ تیری خادم اور تو ان کا مخدوم، وہ سب کی سب تیری غلام ہیں اور تو اُن سب کا آقا، چنانچہ اس بنا پر دنیا کی سب سے زیادہ محفوظ اور مقدس کتاب میں ہمیں یہ تلقین کی جاتی ہے کہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم یعنی ہم نے انسان کو ظاہرًا اور باطنًا جسمانی ہیئت میں اور روحانی ہیئت میں تمام دوسری مخلوق پر فائق پیدا کیا ہے۔"

حکیم عمر خیام نے اپنی ایک رباعی میں گویا انہیں مقاصد کی ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

مقصود ز جملہ آفرینش مائیم — در جسم خرد جوہر بینش مائیم
ایں دائرۂ جہاں چو انگشتری ست — بے ہیچ شکے نقش نگینش مائیم

گویا خیام کے نزدیک اگر اس تمام کائنات کو ایک جسم تصور کر لیا جائے تو انسان کو یقیناً اس جسم کی روح تسلیم کرنا ہوگا، اسی طرح ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

موجود حقیقی بجز انسان نبود — بر فہم کسے ایں سخن آساں نبود
یک جرعہ ازیں شراب بینش می کش — تا خلق خدا پیش تو یکساں نبود

یہاں بھی انسان کو "موجودِ حقیقی" قرار دے کر گویا انتہائی الفاظ میں اس کی عزت افزائی کی گئی ہے۔ انگریزی نظم میں بھی اکثر چیزیں کس قدر پاکیزہ ملتی ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی کا مشہور شاعر جارج ہربرٹ انسان کو یوں ترجیح دیتا ہے ؎

My God I heard this day,
That none doth build a stately
habitation.
But he that means to dwell therein,
What house more Stately hath
there been.
Or can be, that is man, to whose
Creation.
All wings are in decay.

اسی طرح شیکسپیر بھی ہملٹ کی زبانی ایک جگہ کہلواتا ہے ؎

What a piece of work is man
How noble in reason, how infinite
in faculty, in form, and moving
how express and admirable in

action; how like an angel in apprehension; how like a God;

یہ تو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ خدا کے خاص خاص بندے اپنی صفات حمیدہ اور اخلاقِ پسندیدہ کی بنا پر فرشتوں سے بھی افضل ہیں لیکن حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ انہیں انسانی عوارضات اور دنیوی خواہشات کو ملحوظ رکھتے ہوئے "عام" لوگ بھی فرشتوں سے افضل ہیں، اس کے بعد کہاں ہیں۔ وہ غیر ذمہ دار صوفی جو خود افسردہ اور محروم ہونے کے باعث سوسائٹی کو بھی اپنی باتوں سے مسموم کئے بغیر نہیں رہ سکتے، کبھی انہیں یہ کہتے ہوتے سنا گیا ہے کہ انسان بڑا ضعیف ہے، انسان بہت کمزور ہے، انسان سے تو چوپائے اور درخت ہی اچھے ہیں اور کبھی وہ یہ رٹ لگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ زندگی ایک خواب ہے، دنیا رنج و غم کا ایک قید خانہ ہے، عورتوں کے ساتھ دل بہلانے اور عمدہ لباس پہننے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ، اصل میں سچ پوچھئے تو ایسے لوگوں کے پاس ان باتوں کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے سوائے اپنی محرومی اور مردہ دلی کے اور کوئی معقول وجہ نہیں ہے، بھلا جس خدا نے انسان کو ایک مکمل اور اکمل صورت میں پیدا کیا اور جس کی شہادت وہ خود بھی دیتا ہے، کیا وہ اس کی رہائش اور بود و باش کا انتظام پسندیدہ اور خاطر خواہ طور پر نہیں کر سکتا تھا؟ اگر وہ ایسا کر سکتا تھا اور یقیناً اس نے کیا ہے، تو پھر شکوہ و شکایت کے کیا معنی؟ کیا ایسی حالت میں اس کی صنعت کا ناقص اور نامکمل ہونا لازم نہیں آتا؟ اور کیا اس طرزِ عمل

رکھنے والے جاہل صوفیوں کو ہم حقیقی معنوں میں کافر اور زندیق نہ سمجھیں؟ تاریخ پر نظر دوڑائیے، تو غم و حسرت کا یہ عبرتناک منظر یا تو آپ کو ساکن القلب بدھا کی تعلیم ہیں ملے گا، جو غیر فطری ہونے کی وجہ سے چنداں فروغ نہ پا سکی، اور بہت جلد ملیامیٹ ہو گئی یا اس کے مرگ آفریں تاثرات آپ کو ان راہبوں کی شکل و صورت میں دکھائی دیں گے جو بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ سیاہ جبّہ پہنے گرجاؤں میں کھڑے ہیں اور جنہوں نے شادی اور زیب و زینت کو اپنے لئے حرام قرار دے لیا ہوا ہے عقل باور نہیں کرتی کہ علیٰ مسیح کے ہونہار فرزند غم و حسرت اور یاس و اندوہ کے یہی بے جان پتلے ہوں گے۔

پس اگر آپ کو حیاتِ انسانی کا مکمل پروگرام دیکھنا ہو تو نبی آخر الزماں کی طرف رجوع کیجئے، روزمرّہ کی زندگی میں کون سی ایسی ضروری چیز ہے جو آپ کے "اسوۂ حسنہ" میں ڈھل نہ گئی ہو، چنانچہ آپ نے بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی اُس غلط روش کو بُرا جانتے ہوئے غیر مبہم الفاظ میں فرمایا کہ "مجھے اور میری اُمت کو رہبانیت سے کوئی سروکار نہیں، ان تمام تکلفات سے بچ کر رہنا چاہیئے، جو حقیقت میں انسان کی اپنی ایجاد ہیں، انسان اس روئے زمین پر خدا کا خلیفہ ہے لہٰذا تمام دوسری چیزیں اس کے فائدے اور خدمت گذاری کے لئے پیدا کی گئی ہیں، میں خود عطر و گلاب، عمدہ لباس اور بیاہ شادی کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں چنانچہ تم وہ چیزیں استعمال کرو۔ جن سے اپنے خدا کے ساتھ خوشنودی اور شکر گزاری کا اظہار ہو، اور وہ طریقے چھوڑ دو جن میں ناشکری یا محرومی پائی جائے۔"

اس کے علاوہ کس قدر نادان ہیں وہ لوگ بھی جو انسانی زندگی جیسی برتر اور اعلیٰ شے کو پھول، حباب اور شبنم وغیرہ جیسی عارضی اور غیر مستقل چیزوں سے تشبیہ دیتے ہیں، اُن کا اس طور پر نوحہ و فریاد کرنا کہ ہائے دنیا میں انسان کے ذمے فرائض بہت ہیں لیکن زندگی بالکل ناکافی ہے، کہاں تک قرین قیاس ہے اور کیوں اس کی تائید کی جاتی ہے؟ انہیں کوئی اتنا تو بتا دے کہ بھائی! بہت سے چلنے والے کچھوے، بیٹھ رہنے والے خرگوش سے سبقت لے گئے ہیں، دنیا میں کام کرنے والے اور مستعد انسانوں کے لئے دو دن بھی بہت ہیں، اور بہائم کی طرح محض کھا پی کر سو رہنے والوں کے لئے عمر خضر بھی کچھ نہیں۔

انسان اگر غور کرے تو دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے لئے ندامت اور اصلاح کا کافی سے زیادہ سامان لئے ہوئے ہے ؎

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار
آخر سرِ بام لے کے پہنچا تو کہا
مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے انسانی ترقی کا جو معیار قرار دیا ہے اُسے بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

دمادم نقشہائے تازہ ریزد — بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است — بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

اس رباعی میں زندگی کے ارتقائی قانون کا ذکر کیا گیا ہے، فرماتے ہیں

کہ تمہاری زندگی کا نشوونما بھی اگر اس قانون کے مطابق عمل میں نہیں آرہا ہے تو سمجھ لو کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔

اسی مقصد کو ایک اور شاعر نے نہایت بلیغانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اس شعر کی ادبیت حدِ توصیف سے باہر ہے، کہتا ہے کہ پہلے جو چیز انفرادی طور پر ایک انگور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی، اب دورِ ترقی میں آکر وہی چیز شراب کا ایک لبریز پیالہ ہے۔ گویا یہ ستارہ ٹوٹا اور آفتاب بن گیا، جز فنا ہوا لیکن اس نے فنا ہوتے ہی کل کی صورت اختیار کرلی۔

نٹشے بھی اپنے الفاظ میں گویا اسی قانون کی ترجمانی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"پہلے پہل میں نے چلنا پھرنا سیکھا، اب میں اپنے آپ کو دوڑنے کا عادی بناتا ہوں، اس کے بعد میں نے اڑنا سیکھا اور اب مجھے کسی ایسی امداد یا کسی ایسے سہارے کی ضرورت نہیں جو مجھے اپنی جائے قرار سے اٹھا کر لے چلے۔

اب میں اپنے آپ کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں، اب میں مائلِ پرواز ہوں اور ہوا کی وسیع پہنائیوں میں سیر کرتا پھرتا ہوں، اب میری حالت یہ ہے کہ کائنات میں مجھے اپنے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اور اب ایک خدا اپنے جلال اور کبریائی کو نمایاں کئے ہوئے

مجھ میں رقص کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"

گویا نٹشے نے نہایت عمدہ پیرائے میں اس ترقی اور عروج کی ایک طور پر تشریح بھی کردی۔ اب "غیرت اور خودداری" قوتِ عمل اور شرافت نفس کے لئے جس قدر مفید ہو سکتی ہے، اس کا ذکر کر دینا بھی نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ؎

تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

اس کے علاوہ ؎

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

الغرض زندگی کا قرار صرف ذاتی استحکام، غیرت اور خودداری سے ہے ورنہ کمزوری اور ناتوانی تو انسان کے لئے موت و ہلاکت کا پیغام ہے ہر حالت میں یہی اصول پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ ؎

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بے باک ست

جدید شعرائے ایران میں سے رشید یاسمی کی یہ نظم استحکام اور خزیدگی کے متعلق موجودہ شعر کے مفہوم کو اور بھی واضح کئے دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

بیں آں کشن و استوار درخت — باشکیب و قرار و طاقت و سنگ
در بہاراں چو از برِ کہسار — سیل سویش ہمی کند آہنگ

ہمچناں اژدہائے سر بہ نشیب | بر کند پیش راہ و سنگ بجنگ
چوں کماں گرداد بگیر د سیل | او بماند لیسانِ تیر خدنگ
سیل ازیں خیرگی و ستواری | خشم گیر دلیسان شرزہ پلنگ
ہمچو دیوانگاں بر آرد کف | از فزونی غریو بانگ و غرنگ
آخر الامر رہ بگمر داند | سر بزیرا فگند ز عار د ننگ
آدمی زادہ نیست کم ز درخت | غم گیتی فزوں زسیل بجنگ
گر بیا موخت غم زسیل شتاب | من بیا موزم از درخت درنگ
من نہنگم اگرکہ غم موج ست | نگریزد ز پیشِ موج نہنگ

تو گویا اسی ناقابل تسخیر قوت کی نسبت کہا گیا ہے کہ ؎

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

پس ضرورت اس امر کی ہے کہ فطرت کی ہدایات کے مطابق زندگی کے اسی پہلو کو روشن کیا جائے جو سراسر "خیر" ہے۔ اس صورت میں جو شر ہوگا وہ بھی یقین کے نور سے سراپا خیر بن جائے گا۔ اور یہ حق ہمارے لئے خاص طور پر اس لئے ثابت ہے کہ ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اس ضمن میں ہمارے سامنے ایک باریک اور نازک مسئلہ اور در پیش ہے اور وہ یہ کہ عمل کی رفتار ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوا کرتی، اور نہ

ہونی چاہیئے۔ فطرت کا اقتضا بھی یہی ہے۔ کہ انسان کی طبیعت کا اندازہ کرتے ہوئے اس پر ہمیشہ ایک جیسا بوجھ نہ رکھا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کی شاہراہ میں اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں انسان کو انتہائی زور آزمائی سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بعض حالتیں ایسی بھی پیش آجاتی ہیں، جہاں نرمی اور لطافت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اور اگر اس کے خلاف کیا جائے تو نہ صرف آرزو ہی فوت ہو کر رہ جائے گی، بلکہ لازمی طور پر انسان کا احساسِ عمل بھی مردہ ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں کامیابی کی توقع ایک سودائے خام ہے۔

یورپ میں نپولین اعظم، رچرڈ شیر دل، نیرو شاہِ روم اور جولیس سیزر وغیرہ سے بڑھ کر جنگجو اور شورہ پشت بادشاہ شاید ہی اور کوئی ہوا ہو گا۔ لیکن ان کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اپنی ضد اور اصرار کے باوجود فولادی چوٹیں کھا کھا کر بنتیجہ کار کسی غیبی کشش سے مجبور ہو کر "حسن" کی آغوش میں آکر پناہ لیتے تھے۔ چنانچہ جولیس جیسے خود دار بادشاہ کا کلیوپیٹرا ملکہ مصر پر بے طرح مفتون ہونا اور باوجود سیاسی ضروریات کے مسلسل ایک برس تک اس کے پہلو سے جدا نہ ہونا ہمارے دعوے کی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔

پس علامہ موصوف اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

یہ فلسفۂ عمل کا ایک نہایت باریک نکتہ ہے جس کی کیفیتوں کو سوائے وجدان کے اور کوئی چیز معلوم نہیں کر سکتی، پس ضرورت ہے کہ اہل نظر حضرات خوب اچھی طرح سے اس پر غور کریں، ورنہ صرف اسی ایک چیز کا نظر انداز کر دینا بے انتہا ناکامیوں اور حسرتوں کا موجب ہوگا۔

علامہ موصوف کا یہ شعر بھی تقریباً اسی حقیقت پر مبنی ہے ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے

موانعِ عمل

اس سلسلۂ گفتگو میں اب ہم آپ کو چند ایسی چیزیں کیوں نہ بتلا دیں جو عمل کے لئے سدِ راہ ہو سکتی ہیں۔ سو اول تو آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ عمل اور جستجو کے لئے "قناعت" بالکل حرام ہے، انسان اگر اپنا حوصلہ فراخ رکھے تو ضروریات کے لئے راستے خود بخود پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

یعنی جب خدا کا فیض و کرم بے انتہا ہے، تو بندہ اپنے دامن کو کس لئے محدود رہنے دے۔ پس ؎

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

الغرض قناعت اس بارے میں کسی لحاظ سے بھی اچھی نہیں، اس لئے کہ ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشان است
خم و خمخانہ با مہر و نشان است

اس کے بعد جس چیز سے اجتناب چاہیئے وہ "منزل" کا تخیل ہے، کیونکہ منزل سے جہاں انسان کے دلی جذبات مردہ ہوتے ہیں وہاں ساتھ ہی عزم و ہمت کو بھی سخت ضعف پہنچتا ہے، چنانچہ علامہ ممدوح "پیامِ مشرق" میں اسی کی تاکید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

مگو از مدعائے زندگانی — ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوقِ سفر آنگونہ مستم — کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

جہاں ما کہ پایانے ندارد — چو ماہی در یمِ ایام غرق است
یکے بر دل نظر واکن کہ بینی — یمِ ایام در یک جامِ غرق است

یعنی جو دل اپنے اندر جوشِ عمل رکھتا ہو، اس کے نزدیک وقت کی تعیین اور زمانے کی تحدید بالکل مہمل اور بے معنی چیزیں ہیں جس طرح قوائے فطریہ کی کوئی انتہا نہیں، اسی طرح عمل کی وسعتیں بھی بے پایاں ہیں۔

اسی مفہوم کو دوسری جگہ یوں فرمایا ہے ؎

بمنزلِ رہروِ دل در نسازد — بآب و آتش و گل در نسازد
نہ پنداری کہ در تن آرمید است — کہ ایں دریا بساحل در نسازد

اس کے علاوہ "جاوید نامہ" میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور

یہاں بھی منزل اور مقام کو زندگی کی امکانی قوتوں کے لئے مضر قرار دیا گیا ہے، یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لذتِ سیر است مقصودِ سفر　　گر نگہ بر آشیاں داری مپر
ماہ گردد تا شود صاحب مقام　　سیر آدم را مقام آمد حرام
زندگی جز لذتِ پرواز نیست　　آشیاں با فطرتِ او ساز نیست
رزقِ زاغ[1] و کرگس[2] اندر خاکِ گور
رزقِ بازاں در سوادِ ماہ و ہور[3]

اس کے بعد "زبورِ عجم" میں اس مضمون کو جس طور پر بیان کیا گیا ہے وہ اور بھی واضح اور موثر صورت رکھتا ہے۔ بہ طور نمونہ ان پانچ شعروں پر اکتفا کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

مجو پایاں کہ پایانے نداری　　بپایاں تارسی جانے نداری
نہ ما را پختہ پنداری کہ خامیم　　بہر منزل تمام و ناتمامیم
بپایاں نارسیدن زندگانی است　　سفر ما را حیاتِ جاودانی است
زماہی تا بمہ جولانگہِ ما　　مکان و ہم زماں گردِ رہِ ما
بخود پیچیم و بیتابِ نمودیم　　کہ ما موجیم و از تعرِ وجودیم

غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

---

[1] کوّا [2] گدھ۔ یہ دونوں پرندے مردار خور ہیں [3] آفتاب

یعنی زمین و آسماں کی یہ تمام وسعتیں تو ہمارے ایک قدم میں طے ہوئی جاتی ہیں، پھر اس جوشِ عمل کے ہوتے ہم کسی منزل کو کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں، یہ ہمت کی انتہا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ زندگی کے نشو و نما اور عمل کے لئے منزل ایک نہایت مضر چیز ہے، اس لئے کوئی ایسا تصوّر یا کوئی ایسا خیال پیشِ نظر نہیں لانا چاہیے جس سے کسی جائے خاص کی تحدید وقوع میں آئے تو اس مفہوم کے لئے بطور خلاصہ ہمیں ایک دفعہ پھر ہجر و وصال کے اسی نفسیاتی اصول پر نظر دوڑانی چاہیئے۔

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصال
چیست حیاتِ دوام ؛ سوختنِ ناتمام

منزل کے بعد جو شے جد و جہد اور کامیابی کے لئے رہزن ثابت ہوتی ہے، وہ انسان کا شک و شبہ ہے، شک کی مذمت اس سے پہلے بھی ایک جگہ کی جا چکی ہے اور یہ چونکہ "یقین" کے بالکل متضاد واقع ہوا ہے۔ اور اس کی تردید در پردہ یقین کا اثبات ہے، اس لئے آیندہ عنوان میں اس کا ذکر مفصل طور پر کر دیا جائے گا۔

اس کے بعد ڈر اور خوف سے بھی انسان کی عملی قوتیں شکست کھا جاتی ہیں زندگی کی شاہراہ میں کامیابی اُس شخص کے لئے ہے جو کسی چیز سے نہ ڈرے، بلکہ ع

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

کے قانون کو پیشِ نظر رکھ کر اوہامِ باطلہ اور وساوسِ نفسانی کو پامال کرتا ہوا منزل سے گذر جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں ؎

دلِ بے باک را ضرغام[1] رنگ[2] است
دلِ ترسندہ را آہوِ پلنگ است
اگر ہیمے نہ داری بحر صحرا است
اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

نٹشے یہاں بھی خوف و دہشت کی تردید کیسے زوردار پیرایہ میں کرتا ہے چنانچہ اس کے تاثرات بھی ملاحظہ ہوں:

"تم مجھ سے دریافت کرتے ہو کہ کیا کوئی اچھی اور معقول وجہ جنگ و جدل جیسی شے کو بھی مقدس اور پاک بنا سکتی ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہاں "جنگ" ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہر دوسری شے کو مقدس اور پاکیزہ بنا دے۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں جنگ اور لڑائی نے رحم اور خیرات سے زیادہ عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے ہیں اور بسا اوقات مصیبت زدہ اور پریشان حال لوگوں کی دادرسی اور حفاظت تمہاری محبت یا تمہارے رحم نے نہیں کی، بلکہ ان کی نجات تمہاری جرأت اور دلیری سے ہوئی ہے۔

پھر تم مجھ سے دریافت کرتے ہو کہ دنیا میں سب سے بہتر شے کون سی ہے؟ میں کہتا ہوں کہ دنیا میں سب سے اچھی چیز بہادری اور جرأت ہے اور یہی مردوں کی شایانِ شان بھی ہے۔

کسی اچھی چیز کی یہ تعریف کہ وہ میٹھی بھی ہو اور میٹھی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس میں خوبصورتی اور دلکشی بھی پائی جائے صرف نوعمر اور چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے

---

[1] ضرغام۔ شیر [2] رنگ۔ بھیڑ

لئے موزوں ہے اور وہی اس کو سنکر خوش بھی ہو سکتی ہیں؟ یہ تعریف ہمارے تمہارے لئے ہر گز نہیں۔" ۱؎

اسی طرح ایک اور جگہ کہتا ہے:۔

"عقل و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دلیر، بے خوف، خوددار اور صاحب اقتدار ہو کر زندگی بسر کریں، ہماری عقل گویا ایک خوبصورت اور دوشیزہ لڑکی ہے جو صرف اُن لوگوں سے پیار کرتی ہے جو مردانہ وار میدان جنگ میں کود پڑیں۔" ۲؎

اس لحاظ سے شیکسپیر نے بھی اپنی جگہ کچھ بے جا تو نہیں کہا۔

"بزدل موت سے پہلے کئی دفعہ مرتے ہیں، مگر بہادر موت کا مزا صرف ایک مرتبہ چکھ سکتا ہے، دنیا میں میں نے جتنی باتیں بھی سنی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ انسان موت کو زندگی کا ایک لازمی نتیجہ اور قدرت کا ایک اٹل قانون سمجھ کر بھی اُس سے ڈرتے ہیں، حالانکہ یہ تو ایک رسمی سی چیز ہے، اور جب آئے گی سو آئے گی، اس لئے بجائے جبر و اکراہ کے خوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیوں نہ کرو؟" ۳؎

صاحب: ان لوگوں کے تاثرات اپنی جگہ کچھ بھی ہوں اور کیسے ہی زور دار الفاظ میں انہوں نے خوف کی مذمت کیوں نہ کی ہو۔ لیکن ہم تو یہاں تک بھی کہہ دینے کو تیار ہیں کہ خوف جیسی مضر شے کی نسبت خدا سے بھی نہیں دبنا چاہیئے۔ ہم تو یہ پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ آپ رحم و الفت کی بجائے اُسے

۱؎ خطبات زرتشت۔ عنوان "جنگ اور جنگجو"

۲؎ " " " لکھنا اور پڑھنا"۔ ۳؎ جولیس سیزر۔ ایکٹ دوم منظر دوم

قہر و غضب کا مجسمہ خیال کیجئے، آپ کی مردہ اور سست رگوں میں بھی عقیدہ زندگی اور حرارت پیدا کرے گا. لیکن اس تعلیم سے ہمارا مدعا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس قہر و غضب اور خوف و ہراس کا شکار آپ خود بن جائیں، صورت بگاڑ لیں کپڑے پھاڑ لیں، افسردہ و محزون ہو ہو کر سوسائٹی سے کنارہ کش ہو جائیں، اور لٹیں دراز کر کے کسی تاریک حجرے میں چھپ کر زندہ در گور ہو جائیں، بلکہ اس سے ہمارا مطلب یہ تھا. کہ ہر باطل اور بدخواہ قوت کے لئے آپ کو سراپا قہر کی بجلی بن جانا چاہیئے. آپ اس پر گریں اور اس بے پناہ طریق پر گریں کہ اس کا بھیجا پاش پاش ہو جائے. اس کے خرمن ہستی کو جلا کر سیاہ کر ڈالیں. وہ اگر آپ کو بُری نظر سے دیکھے، یا آپ کے خلاف اپنے دل میں نفرت و حقارت کے جذبات استوار کرے تو آپ بلا تامل اس سے ٹکرائیں، اور اس خبیث انسان یا کینہ پرور جماعت کو اس پاکیزہ ہوا میں سانس تک لینے کی مہلت نہ دیں، خدا کے قہرِ و جلال کا بہترین مظاہرہ فقط اسی طور پر ہو سکتا ہے، ورنہ آپ خوف سے خود ہی مرتے رہے، اور عذاب کے تصور نے آپ کی امکانی قوتوں کو بے حس کر دیا. تو خلقِ خدا کو اس طرزِ عمل سے کیا فائدہ پہنچے گا؟

یقین

اور سنئے یقین عمل کے لئے روح رواں ہے، شک کے ہوتے ہوئے انسان ایک قدم بھی اطمینان کے ساتھ آگے نہیں بڑھ سکتا.

عمل کے لئے قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور شک اس قوت کو بالکل سلب کر لیتا ہے، پس نہایت ضروری ہے کہ ہر کام سے پہلے اپنے یقین کو پختہ کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب اسی حقیقت کے پیشِ نظر فرماتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

ہمیشہ سے یقین ہی کی زندگی ایک کامیاب زندگی چلی آئی ہے، اور فقط اسی سے انسان دنیا میں اپنے لئے فوز و فلاح کا سامان مہیا کرتا ہے۔

فرمایا:۔ جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

وہم و گماں سے بھری ہوئی دنیا، شکوک و شبہات سے بھری ہوئی دنیا، مکر و فریب سے بھری ہوئی دنیا۔ خود غرض اور کینہ توزی سے بھری ہوئی دنیا، گمراہ کن خیالات اور مسموم ارادوں سے معمور دنیا، وہ دنیا جس میں مضمحل اور مایوس لوگوں کو دیکھ کر جذبات بالکل مردہ، عقل کوتاہ اندیش اور طبائع سست ہو جایا کرتی ہیں۔ ایسی دنیا میں انسان کے تمام تر فضائل اور امکانی نشو و نما کی تعمیل "یقین" اور صرف یقین ہی سے ہو سکتی ہے، یہ گویا اس بحرِ بیکراں میں روشنی کا ایک ایسا مینار ہے، جو ہمیں تباہی اور تشویش سے بچاتا ہے۔

اسی لئے فرمایا ہے کہ ؎

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

یقین پیدا کر اے ناداں یقین سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اور اسی طرح ؎

یقیں مثل خلیل آتش نشینی　　یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار　　غلامی سے ہے بدتر بے یقینی

(بال جبریل)

غلامی انسان سے ارتقائے حیات کا مادہ بالکل سلب کر لیتی ہے لیکن پھر بھی جو چیز اسے دوبارہ زندہ کر سکتی ہے، وہ یقین کے سوا اور کوئی چیز نہیں ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

پھر ایمان بھی کیا ہے؟ اپنے معانی اور مقاصد کے لحاظ سے غور کیا جائے تو یقین اور ایمان کوئی دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، پس ایمان ہی میں یہ اعجازی قوت بھی ہے کہ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے پلٹ جاتی ہیں تقدیریں

سلطنت، حکومت اور دنیوی جاہ و اعزاز تو اس کے ادنیٰ غلام ہیں ؎

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

لیکن جب تک یقین کے ساتھ استقلال اور محبت کا امتزاج نہ ہو یہ جذبہ بھی بالکل ناقص اور نامکمل رہتا ہے۔ چنانچہ ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

الغرض یقین جیسی مبارک شے نہ اور کوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، جب کسی قوم کے افراد یقین کو اپنا معیارِ عمل قرار دے لیں تو نہ صرف وہ ذاتی طور پر ہی خوشحال اور باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں، بلکہ اس سے ملّی اور اجتماعی مقاصد کو بھی حد درجہ تقویت پہنچتی ہے ؎

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی ایک رباعی ہے ؎

ہمائے علم تا افتد بدامت یقیں کم کن گرفتارِ شکے باش
عمل خواہی یقیں را پختہ تر کن یکے جوئے و یکے بیں و یکے باش

ڈاکٹر صاحب نے اس جگہ یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ شک علمی حیثیت سے مفید ہو تو ہو، عمل کے ساتھ اسے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں اس قول کی تردید مقصود نہیں، لیکن ساتھ ہی اتنا عرض کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ علم کو جو ایک طور پر عمل کا رہبر اور ہادی سمجھا جاتا ہے، شک جیسی خبیث اور زہریلی شے سے بدرجۂ اولیٰ پاک ہونا چاہیئے۔

ایک ایسے شخص کو جو انتہائی ذوق و شوق سے تحصیل علم کے لئے آمادہ

ہوا ہو'، یہ کہنا کہ اگر تمہیں کمال حاصل کرنا ہے تو "شک" کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہ دینا، کہاں تک مفید اور معقول سمجھا جا سکتا ہے ؛ اس طور پر "ہما" تو ایک بڑی چیز ہے، ساری عمر صرف کر دینے کے بعد وہ بے چارا شاید کسی کوّے، کو بھی بمشکل اپنے دام میں پھنسا سکے گا۔

اور پھر نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھئے تو شک علم کے حق میں کوئی مفید چیز نہیں ہے، علم کئی طرح سے حاصل کیا جاتا ہے، ایک علم وہ ہے جو کتابی مطالعہ سے حاصل ہو، دوسرا وہ ہے جسے ہم مشاہدہ سے حاصل کرتے ہیں، تیسرا وہ ہے جو تجربہ سے حاصل کیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام حالات میں یقین اور اذعان کا ہونا ازبس ضروری ہے، ورنہ علم کے اندر وہ شگفتگی اور وسعت کیونکر پیدا ہوگی۔ جو اس کا اصل منشا ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر ڈاکٹر کیو مشہور فرانسیسی ماہر نفسیات ایک جگہ لکھتا ہے :۔

"جس کورس پر تم باوجود انتہائی محنت کے دو سال میں بھی عبور حاصل نہیں کر سکتے اور اپنی صحت کو برباد کر دیتے ہو، یقین اور حُسنِ اعتقاد کے ہوتے اسی کورس پر صرف چھ ماہ میں حاوی ہو سکتے ہو۔"

حکما اور فلاسفر یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ تصوّر کا اثر انسانی جذبات پر بہت گہرا ہوتا ہے، ہمارے نزدیک بہتیرے الفاظ ہیں جو انسانی تصوّر کے محرک ہی نہیں، بلکہ موجد بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ نپولین کو 'اگر'، 'مگر'، 'شاید'، 'میں نہیں جانتا'، 'میں نہیں کر سکتا'، 'یہ ناممکن ہے' وغیرہ جیسے الفاظ سے سخت نفرت تھی اور وہ انہیں بے وقوفوں کے الفاظ کہتا تھا، حال میں نٹشے نے بھی ایسی

چیزوں کو دھوکے کی ٹٹی تبلایا ہے، پھر ہم "شک" جیسے ناپاک لفظ کو بھی کیوں اسی ذیل میں شمار نہ کریں اور کیوں اس کی خاطر کوئی مستثنےٰ حالت تجویز کی جائے ؟

ممکن ہے۔ اس جگہ "شک" کی یہ تاویل کی جائے کہ اس سے ایک طالب علم کے لئے استقلالِ طبعی مقصود ہے اور یہ کہ وہ علم کے کسی محدود پیمانے پر قانع ہو کر نہ بیٹھ رہے، اور اپنی کوشش کو مسلسل طور پر جاری رکھے، لیکن یہ حجت بھی بظاہر خوش آیند اور دلچسپ ہونے کے باوجود ہمارے نزدیک چنداں معقول نہیں، کیونکہ جب علم کی غایت یہ ہے کہ اُس سے دوسروں کو مستفیض کیا جائے اور تلقین و تبلیغ کا فریضہ جاری رہے، تو ایک شخص اپنی معلومات کی نسبت بذاتِ خود مذبذب اور مشتبہ ہوتے ہوئے اوروں کو اس کی تاکید کس طرح سے کرے گا ؟ اور اگر کرے بھی تو ایسی بودی اور بے روح تاکید سننے والوں کے حق میں کس حد تک مفید اور موثر ثابت ہو گی ؟

اس کے علاوہ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا، اس کی ہستی اور اس کے تصرفات کا علم بھی تو آخر ایک علم ہی ہے، اس نظریے کی رو سے کیا ہم یہاں بھی شک کو دخل دے لیں ؟ اور اگر ایسا ہو جائے تو "ایمان" کے کیا معنی ہوں گے ؟ یہ اس وقت محض ایک "تبکدہ تصورات" ہو گا، یا شریعت اور آئین الٰہیہ کے ناقابل تردید حقائق ہوں گے ؟ اگر ہم یہ مشورہ صحیح مان لیں، تو خدا کی وحدت اور یکتائی کے متعلق ہمارے پاس کون سی پختہ دلیل ہو، اور اس پر "کفر" اور "اسلام" میں کون سا نمایاں فرق رہ جائے گا۔ ؟

بہر کیف سچ پوچھئے تو زہر ہر حالت میں زہر ہی ہے اور "شک" سے ہمیشہ اُسی طرح مجتنب رہنا چاہیئے جس طرح انسان زہر سے پرہیز کرتا ہے۔

گویا اس طرح کتاب کو شروع کرنے سے اب تک ہم یہ تمام باتیں آپ پر سلسلہ وار روشن کر چکے ہیں کہ اعمال و اخلاق کے لئے سب سے پہلی اور بنیادی چیز توحید ہے، عزتِ نفس اور تنظیم جذبات کے بغیر خودی کا قیام ناممکن ہے، پھر ضبطِ نفس کا فقدان خودی کو آہستہ آہستہ زائل کر دیتا ہے، اس کے بعد ضبطِ نفس بجائے خود لفظِ "عشق" کا صحیح مفہوم سمجھنے پر موقوف ہے۔ عشق کا قرار انسانی دل میں ہے، جسے سوزِ خرد کا ایک دوسرا نمونہ کہنا چاہیئے۔ پھر دل کی حیات بھی فی الحقیقت ذوقِ تمنّا اور بقائے آرزو کی شرمندۂ احسان ہے۔ اس کے بعد یہ واضح کیا گیا کہ آرزو بھی ہجر و فراق کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر جذبۂ عمل کے لئے بعض مخالف اور مضر چیزوں کا ذکر کیا گیا اور ساتھ ہی تلقین کر دی گئی کہ اس کا سب سے بہتر اور مخلص دوست "یقین" ہے جو اس کی رہنمائی اور امداد کا حق پوری سرگرمی سے ادا کرتا ہے۔ یہ ہے گذشتہ بیانات کا پروگرام جس کا یہاں اعادہ کر دینا ضروری سمجھا گیا اور جسے ذہن میں ہر طرح سے محفوظ رکھنا چاہیئے۔

معراجِ رُوح

اب ہم آپ کو بتلائیں گے کہ یقین سے "روح" کس قدر منور، اور کس قدر بر پرواز آتی ہے۔ قرآن مجید اور قوانین فطرت کے ربط و ضبط

سے انسانی روح کے اندر جو بیداری پیدا ہوتی ہے، وہ اُسے کسی غیر محدود پرواز کے لئے مجبور کر دیتی ہے، ایسی حالت میں زمین پر اُس کا قرار ناممکن ہو جاتا ہے اور وہ پیمانِ الست سے کامل طور پر محرمِ راز ہونے کی وجہ سے جسمِ مادّی کے اندر سخت تکلیف محسوس کرتی ہے لیکن جب تک انسان اس کیفیت کو سوزِ باطن سے معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے، تحریرًا یا تقریرًا اس کا سمجھنا بالکل دشوار امر ہے، کیونکہ یہ ایک جذبۂ الٰہیہ ہے اور اس کا تعلق سراسر وجدان کے ساتھ ہے، چنانچہ علامہ اقبال بھی "پیامِ مشرق" میں اسی وجدانی کیفیت کو کسی قدر والہانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

درونم جلوۂ افکار ایں چیست
برونِ من ہمہ اسرار ایں چیست
بفرما اے حکیمِ نکتہ پرداز
بدن آسودہ جاں سیّار ایں چیست

روح کی اسی پرواز کا ذکر "جاوید نامہ" میں اس طور پر کیا گیا ہے:۔

خاک و در پروازِ مانندِ ملک | یک رباطِ کہنہ در راہش فلک
می خلد اندر وجودِ آسماں | مثلِ نوکِ سوزن اندر پرنیاں

چوتھے مصرع میں روح کے سبک رفتار اور تیز رو ہونے کو اس خیال سے کہ وہ آسمان کو بھی بہ سہولت تمام عبور کرتی ہوئی صاف نکل جاتی ہے، اس سوئی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس سے ریشم کو سیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ سوئی کا یہ فعل ادنیٰ سا اشارہ کا محتاج ہوا کرتا ہے لیکن اتنی سی بات نے

بھی معانی کے اندر جو حُسن اور لطافت پیدا کر دی ہے، وہ اہلِ نظر حضرات پر ظاہر ہے۔ اسی طرح روح کے معراج کو ایک اور شعر میں یوں ظاہر فرمایا ہے ؎

سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

اور پھر ؎

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اس شعر میں پھر حسن تشبیہ کی انتہا کر دی گئی ہے، اول تو روح کی تیزی اور برق رفتاری ملاحظہ ہو کہ آسماں کے ستارے بھی اُس کی گردِ راہ بن جاتے ہیں. اور پھر ساتھ ہی گرد راہ سے جو ذرّے ہوا میں اڑ کر چمکنے لگتے ہیں، انہیں جگمگاتے ہوتے ستاروں کے سامنے رکھ کر دیکھئے کہ بیان میں کتنی نزاکت اور موسیقی پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن روح کا یہ معراج بغیر ذکرِ الٰہی کے ناممکن ہے. چنانچہ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ الصّلوٰۃ معراج المومنین یعنی نماز مومنوں کے لئے روحانی عروج ہے، گویا جس وقت بندہ کمالِ عجز سے اپنے مولا کے سامنے سجدہ کرتا ہے، تو اس کا وہ جھکنا ہی اس کی روح کا صعود ہے، خاک پر اپنی جبیں رکھ دینے پر وہ حقیقت سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور یہیں پہنچ کر اس کو وہ تسکین حاصل ہوتی ہے جو کسی ہم جنس کو اپنی جنس شے سے مل کر حاصل ہونی چاہیئے، چنانچہ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ منہا خلقنکم و فیہا نعیدکم

ومنہا نخرجکم تارۃً اخری[1] کا فلسفہ بھی بالکل یہی ہے پس انہی فوائد کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب نے بھی کئی ایک جگہ اس کی تاکید فرمائی ہے "اسرارِ خودی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

لا الہ باشد صدف گوہر نماز | قلب مسلم را حج اصغر نماز
درکفِ مسلم مثالِ خنجر است | قاتلِ فحشا و بغی[2] و منکر است

نماز کی اس سے بڑھ کر فضیلت اور کیا ہو گی کہ قیصر کا خون بھی وضو کے یک قطرۂ آب کی قیمت نہیں ہو سکتا ؎

قطرۂ آب وضوئے قنبر[3]ے
در بہا برتر زخونِ قیصرے

اخوتِ اسلامیہ

اخوت اسلام کا ایک وصفِ امتیازی ہے اور اس سے افکار و اعمال کی وحدت اور قومی تقویت مقصود ہے۔ قرآن مجید نے اس کی اہمیت اور

---

[1] "خاک ہی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ اسی میں تمہیں لوٹ کر جانا ہوگا اور اسی سے دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے"۔

[2] تلمیح بآیہ شریفہ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشآء والمنکر الخ

[3] قنبر حضرت علی رضہ کے غلام کا نام ہے۔

ضرورت کو یوں ذکر کیا ہے۔ فاذکروا نعمت اللہ علیکم اذکنتم اعداءً فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہٖ اخواناط یعنی خدا کے اس احسان کو یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اور مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹ رہے تھے، تو اُس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالی (جذبۂ محبت و مودت قائم کیا) اور تم آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔ قوم کی عزت اور خوشحالی اسی اصول کی پابندی سے وابستہ ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے بھی جس قدر اخوتِ اسلامیہ کی حفاظت کے لئے تاکید فرمائی ہے کسی اور چیز کے لئے نہیں فرمائی، اولاً تو اصولی طور پر فرماتے ہیں کہ ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اس کے بعد تلقین کی جاتی ہے کہ ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

لیکن اخوت ہے کیا چیز؟ اس کی تشریح "جاوید نامہ" میں مفصل طور پر کی ہے، فرماتے ہیں ؎

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ؟ | با ہزاراں چشم بودن یک نگہ!
اہلِ حق را حجت و دعویٰ یکے ست | خیمہ[1] ہائے ما جدا دلہا یکے ست!
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب | یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب!

---

[1] خیمہ ہائے ما جدا، عربی ضرب المثل

یک نگاہی را بچشم کم مبیں　　　از تجلی ہائے توحیدست ایں

ملتے چوں می شود توحید مست
قوّت و جبروت می آید بدست

روحِ ملت را وجود از انجمن　　　روحِ ملت نیست محتاج بدن!

تا وجودش را نمود از صحبت ست　　　مرد چوں شیرازہ صحبت شکست!

مردہ؟ از یک نگاہی زندہ شو　　　بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

وحدتِ افکار و کردار آفریں
تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں!

ان تمام اشعار کا حاصل یہ ہے کہ اخوتِ اسلامیہ ایک خالص فطری ملکہ ہے جس میں تکلف اور بناوٹ کو کوئی دخل نہیں، اور اس کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہے، جس کے لئے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ کا غالب اور اٹل قانون ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے، ورنہ عدم تعمیل کی صورت میں ذلت اور محکومی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

لیکن یہاں اس حقیقت کا جان لینا بھی ضروری ہے کہ اخوت اسلامیہ کوئی ایسی اخوت ہرگز نہیں ہے جیسے دیگر اقوام کی رسمی اور ظاہری اخوت سے کسی طرح کا واسطہ ہو، بلکہ مادہ پرست اور مستبد اقوام کی جمعیت کو "اخوت" کے لفظ سے تعبیر کرنا بھی بہت بڑی غلطی ہے، چنانچہ انہیں دو مختلف حیثیتوں کی تفریق کرتے ہوتے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

یہ شرف اسلامی اخوت ہی کو حاصل ہے کہ اس میں ہر فرد کی عزت ساری قوم کی عزت اور ہر فرد کی ذلت ساری قوم کی ذلت ہے، یہی ایک ایسی جمعیت ہے جہاں انسان ذمہ دارانہ طور پر خودی کا پورا اور مکمل وقار حاصل کر لیتا ہے، اختیارات اور ذاتی قوت کا سچا احساس اسی اور صرف اسی جمعیت کی پیوستگی سے حاصل ہوتا ہے۔ انسانی اوصاف صحیح معنوں میں یہیں آ کر روشن ہوتے ہیں اور یہ تمام چیزیں دنیا کی کسی دوسری جماعت میں ہرگز نہیں پائی جاتیں۔

اس ضمن میں مثال کے طور پر ایک واقعہ نقل کرنا ضروری ہے:۔

"رموز" میں جہاں عربوں کے ایران پر حملہ آور ہونے کے حالات درج ہیں، وہاں لکھا ہے کہ یزدجرد کے ایک سپہ سالار کو ایک مسلمان سپاہی نے اسیر کر لیا وہ مکار سپہ سالار اپنی بلند شخصیت کو چھپاتا ہے اور معمولی سپاہی کی حیثیت میں اُس سے "جان بخشی" کرا لیتا ہے، جب جنگ کا خاتمہ ہوتا ہے اور ایران کی سلطنت تباہ ہو جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ جاپانی ہے۔ اُسے ایک قیدی کی حیثیت سے حجازی افواج کے سپہ سالار ابو عبیدہؓ کے حضور میں لاتے ہیں اور اس جھوٹ کے لئے قتل کی سزا دلانا چاہتے ہیں۔

لیکن ابو عبیدہؓ جواب میں فرماتے ہیں ؎

گفت اے یاران مسلمانیم ما | تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما
نغمۂ عثماں نوائے بوذر است | گرچہ از حلقِ بلال و قنبر است
ہر یکے از ما امینِ ملت است | صلح و کینش صلح و کین ملت ست
ملت ار گردد اساسِ جانِ فرد | عہدِ ملت می شود پیمانِ فرد
گرچہ جاپاں دشمنِ ما بودہ ست | مسلمے او را اماں بخشودہ است

خونِ او اے معشرِ خیر الانام
بر دمِ تیغِ مسلماناں حرام

اسلامی اخوت کا اس سے بہتر اور شاندار مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایسی خطرناک صورت میں بھی ایک فرد کے قول کو ساری جماعت کا فیصلہ تسلیم کر لیا جائے، تاریخ ایسی نظائر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اسی طرح کا ایک زرّیں واقعہ "جندی سابور" میں پیش آیا جبکہ مسلمان کئی دن تک اس کا محاصرہ کیے رہے، آخر ایک روز شہر والوں نے خود شہر کا دروازہ کھول دیا اور کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ مسلمانوں کو اُن کے اطمینان پر تعجب ہوا اور اس کا سبب دریافت کیا۔ شہر والوں نے کہا تم ہم کو جزیہ کی شرط پر امان دے چکے ہو، اب کیا جھگڑا رہا۔ سب کو حیرت تھی کہ امن کس نے دیا، تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایک غلام نے لوگوں سے چھپا کر امن کا رقعہ لکھ دیا ہے۔ ابو موسےٰ سپہ سالار افواج اسلامیہ نے کہا کہ ایک غلام کی حجت نہیں ہو سکتی۔ شہر والے کہتے تھے کہ ہمیں آزاد

اور غلام کی تفریق معلوم نہ تھی۔ آخر حضرت عمرؓ کو خط لکھا گیا۔ انہوں نے جواباً تحریر فرمایا کہ مسلمانوں کا غلام بھی مسلمان ہے اور جس کو اس نے امان دی ہے، اُسے تمام مسلمان امان دے چکے ؎

نغمۂ عثمان نوائے بوذر است
گرچہ از حلقِ بلال و قنبر است

اس کے علاوہ جب ہرمزان شاہِ فارس خود ابو موسیٰ کے ہاتھ سے گرفتار ہو کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں فیصلہ کے لئے بھیجا گیا ہے اور اس ضمن میں جو سلوک اس کے ساتھ کیا گیا وہ بھی "ایفائے عہد" اور "اخوت اسلامیہ" کی ایک بہترین مثال ہے۔ قادسیہ کے بعد ہرمزان نے کئی دفعہ سعد سے صلح کی تھی اور ہمیشہ اقرار سے پھر جاتا تھا۔ شوستر کے معرکے میں دو بڑے مسلمان افسر اس کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، حضرت عمرؓ کو ان باتوں کا آنا رنج تھا کہ انہوں نے ہرمزان کے قتل کا پورا ارادہ کر لیا تھا، تاہم اتمامِ حجّت کے طور پر عرض و معروض کی اجازت دی۔ اُس نے کہا کہ "عمر! جب تک خدا ہمارے ساتھ تھا، تم ہمارے غلام تھے۔ اب خدا تمہارے ساتھ ہے اور ہم تمہارے غلام ہیں۔" یہ کہہ کر پینے کا پانی مانگا۔ پانی آیا تو پیالہ ہاتھ میں لے کر درخواست کی کہ جب تک یہ پانی نہ پی لوں، مارا نہ جاؤں۔ حضرت عمرؓ نے منظور کیا۔ اس نے پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ "میں اسے نہیں پیتا اور اس لئے شرط کے مطابق تم مجھ کو قتل نہیں کر سکتے۔" حضرت عمر اس مغالطے پر حیران رہ گئے۔ ہرمزان نے کلمۂ توحید پڑھا۔ اور کہا کہ میں پہلے ہی اسلام لا چکا

تھا، لیکن یہ تدبیر اس لئے کی کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ میں نے تلوار کے ڈر سے اسلام قبول کیا۔ حضرت عمرؓ نہایت خوش ہوئے اور اُسے خاص مدینہ میں رہنے کی اجازت دی اور اس کے واسطے دو ہزار سالانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہرمزان بالفرض دھوکا ہی کرتا، جیسا کہ اس نے بارہا کیا تھا جب بھی حضرت عمرؓ ایفائے عہد پر ہر لحاظ سے مجبور تھے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں صرف حضرت عمرؓ ہی نہیں، بلکہ اُن کے ساتھ ہزارہا مسلمانوں کا انتظام بھی برباد ہو جاتا۔

پھر اخوتِ اسلامیہ کی پاس داری اور ایفائے عہد کی نسبت فتح دمشق کا واقعہ بھی تاریخ اسلام میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ خالد بن ولیدؓ کئی ماہ سے مسلسل محاصرہ کے بعد انتہائی جانکاہی سے شہر کو فتح کر لیتے ہیں، لیکن چوں کہ وہاں کے چند حیلہ ساز اور عیار پادریوں نے شہر کے دوسرے پھاٹک سے ابو عبیدہؓ کو فوراً صلح پر متفق کر لیا ہے۔ اس لئے خالد بن ولید کو بھی ان عہد کے احترام میں ناچار اُن سے متفق ہونا پڑتا ہے اور اس طرح اہل دمشق میں سے کسی کا بال بیکا بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہے اسلامی وحدت اور یہ ہے صدق و خلوص کا صحیح منظر۔

لیکن اس کے مقابلہ میں موجودہ مسلمانوں کی جو حالت ہے، اس کی ابتری کا بھی کوئی اندازہ نہیں۔ جب اخوت کا وہی معیار ٹھیرا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے تو یہاں اس کی معمولی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اطباعِ ہوس اور ذات پات کے امتیاز نے قومی شیرازے کو بالکل برباد کر دیا ہے، اجتماعی

زندگی کا کسی کو احساس تک نہیں رہا۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

پس اخوت اسلامیہ کو جس چیز نے سب سے زیادہ ضعف پہنچایا ہے وہ قومیت اور ذات پات کا امتیاز ہے، قومیت تو آپس کی محبت اور وحدت کے لئے ایک بلائے آسمانی ہے، اور جب تک اس کا قلع قمع نہ کر لیا جائے گا، اُمت کے لئے عزت اور وقار کا حاصل ہونا ناممکن ہے، یہ عالمگیر اخوت کے راستے میں ایک سنگ گراں ہے اور اس کی حمایت کرنا اپنے لئے تباہی اور موت کا سامان پیدا کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے جگہ جگہ پورے زور سے اس کی تردید کی ہے، چنانچہ بغیر کسی تخصیص کے فرماتے ہیں ؎

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خون مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

اور فلاح و بہبود کا راز تو فقط یہی ہے کہ ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ملت و آئین کی یہ رسمی تحدید اسلامی نظریئے کے سراسر خلاف ہے۔

اس لئے ؎

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

پھر فرماتے ہیں ؎

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

اور حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

گر نسب را جزوِ ملت کردۂ
رخنہ در کارِ اخوّت کردۂ

اس کے علاوہ "پیام مشرق" میں بھی جس انداز سے قومیت اور نسب کی قباحتوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اپنے اندر نہایت جوش اور اثر کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تو اے کودک منش خود را ادب کُن
مسلماں زادۂ ترکِ نسب کُن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست
عرب نازد اگر ترکِ عرب کُن

اور حاصل اس تمام بحث کا یہ ہے کہ ہمارا جذبۂ اخوت زمان و مکان کی قید سے بالکل آزاد ہے، یہ ایک روحانی رشتہ ہے، جسے مادّی اور صوری امتیازات سے قطعاً کسی طرح کا واسطہ نہیں ؎

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما در ما پروردۂ یک نو بہاریم

وطنیّت

اخوت اسلامیہ کے ساتھ ہی وطنیت کا مسئلہ طے ہو جانا بھی نہایت ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر یہ بحث بالکل ناقص اور نامکمل رہ جائے گی۔ اس کی تشریح گویا لفظ "اخوّت" سے ایک نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے۔

بہت سے ایسے لوگوں کو جو مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام کے فلسفۂ اخوّت سے بہت دور جا پڑے ہیں، یہ کہتے ہوتے سنا گیا ہے کہ "جذبۂ حب الوطنی امنِ عالم کا سب سے بڑا دشمن ہے"۔ اور اپنے اس قول کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ حب الوطنی ہی سے تعصب اور عناد پیدا ہوتا ہے اور تعصب ہی امن کا دشمن ہے۔

لیکن کیا اچھا ہوتا۔ اگر ایسے "یورپ زدہ" حضرات عقل کی فسوں کاریوں اور ابلہ فریبیوں کو تھوڑی دیر کے لئے بالائے طاق رکھتے ہوئے اس مسئلے کا حل عشق؛ اور سوزِ باطن سے چاہیئے۔

کیا یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور مختلف اداروں کے ایڈیٹر ہوتے ہوتے ان کی غیر ذمہ دارانہ روش اس درجہ افسوسناک ہوگئی ہے کہ وہ ملک کے نوجوان طبقے کو قومی وملّی احساسات کی عالمگیر وسعت میں کبھی بے کار کر دینا چاہتے ہیں اور کیا ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی حیثیت سے وہ آج تک اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ اسلام وطنیت کے کسی محدود زاویہ نگاہ کا قائل ہی نہیں ؟ دنیا کی کوئی دوسری قوم کسی وطنیت کی قائل ہو. تو یہ اُسی کو مبارک رہے، لیکن اسلام جیسے وسیع اور فطری مذہب میں ایسی تنگ نظری اور بے جا تحدید کی کوئی گنجائش نہیں۔

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

وطنیت کا نظریہ اتنا غلط اور بے بنیاد نظریہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کی عالمگیر اخوت اور قومی وحدت کو سخت صدمہ پہنچایا ہے، مسلمانوں کی تاریخ اور مذہبی روایات اس چیز کے سراسر منافی ہیں، کیا انہیں اسپین کا وہ ساحل بھول گیا ہے، جہاں اسلام کے ایک جانباز سپہ سالار طارق نے کشتیوں کو آگ کی نذر کرتے ہوئے وطنیت کے عقدے کو عملاً حل کر کے رکھ دیا تھا۔ اگر یاد نہیں ہے تو ڈاکٹر صاحب کی زبانی سن لیجئے ؎

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بنگاہِ خرد خطا ست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست

خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

دیکھ لیجئے یہاں بھی معترض عقل ہی ہے اور اس کے مقابلے میں جو چیز اس ذہنیت کو پاش پاش کرتی ہے وہ طارق کا جذبۂ عشق ہے۔

ہیں تو یہ گنتی کے صرف تین ہی شعر لیکن علامہ اقبال نے ان چند الفاظ میں بھی واقعات اور جذبات کی کسی نازک سے نازک اور باریک سے باریک کیفیت کو بھی فوت نہیں ہونے دیا ہے۔ اولاً طارق کے ہمراہیوں کا ان کشتیوں کو جن سے وہ دریا کو عبور کر کے آئے تھے جلتے ہوئے دیکھنا اور دیکھ کر یکایک گھبرا اٹھنا، پھر وطن کی مہجوری، بال بچوں کی جدائی اور جان کے خوف سے اس "خلافِ عقل" حرکت کا سبب دریافت کرنا اور پھر طارق کا ان کی اس گھبراہٹ اور بے چینی کو دیکھ کر مردانہ وار ہنس دینا اور ہنستے ہوئے اپنی جرأت اور بہادری کے جوش میں تلوار کے قبضے پہ ہاتھ لے جانا۔ اور پھر کمال جسارت سے یہ کہنا کہ ع

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

تمام ایسے واقعات ہیں جنہیں پڑھ کر خون رگوں کے اندر جوش مارنے لگتا ہے اور سارے کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

تیسرا شعر تو خاص طور پہ شاعری اور آرٹ کا ایک ایسا بلند پایہ شاہکار ہے کہ شاید ہی اس کی نظیر کوئی دوسری چیز ہو سکے، محاکات کا انتہائی کمال اور واقعات کی صحیح ترجمانی اسی کا نام ہے۔

تو پھر طارق کے جواب کو آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ آخر مقصد اور مفہوم تو اسی آیت کا ہے کہ وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم یعنی "خدا نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، یہ وعدہ کیا ہے، کہ انہیں اُسی طرح زمین کا وارث اور مختار بنا دے گا جس طرح کہ پہلوں کو بنایا تھا"۔ تو کیا اس کے بعد بھی اسلام کے نزدیک وطنیّت اور اخوّت کی کوئی تحدید باقی رہ جاتی ہے؟ پس معلوم ہوا کہ یہ ذہنیت بھی عصر حاضر کی پیدا کردہ ایک "بدعت" ہے اور صحیح اسلامی جذبات کسی صورت میں بھی اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس ضمن میں یہ بھی یاد رہنا چاہیئے کہ عالمگیر اخوّت اور اسلامی وحدت وجمعیت کا مقصد جوع الارض اور ملک گیری کی ہوس ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے تو بدامنی اور ظلم واستبداد کا ثبوت ملتا ہے، بلکہ اس کا مدعا نیکی، تقوی، جمہوریت، آزادی رائے اور مساوات کا درس دینا ہے اور پھر یہ سب کچھ بھی خلافت الٰہیہ کے استحکام کے لئے ہے، انسانیت کی تکمیل کے لئے ہے اور دنیا کو اس کی علمی اور عملی گمراہیوں سے نجات دلانے کے لئے ہے۔

پس اس سے زیادہ مبارک اور شاندار خدمت اسلامیوں کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے اور یہ ایک ایسا احسان ہے جس سے قوموں کی گذشتہ تاریخ کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، اور اگر اب بھی

مسلمان توجہ کریں تو اُن کے لئے یہ حق خاص طور پر ثابت ہے ؎

یہ نکتہ سرگزشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسبان تو ہے

الغرض وطنیت کے اس زہریلے تخیل کی ہر حالت میں تردید ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان شواہد کے باوجود بھی وہ کون سے لوگ ہیں جو وطنیت کے ایسے پست اور افسردہ نصب العین کی حمایت کرتے ہیں، حالانکہ عمل اور ترقی کے لحاظ سے بھی تو کوئی سلیم الفطرت انسان اِسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ علاّمہ اقبال نے خاص طور پر پورے جوش اور قوت سے اس کے خلاف جہاد کیا ہے۔ چنانچہ اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ماکہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم — چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما — شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما
مستِ چشمِ ساقیِ بطحاستیم — در جہاں مثلِ مے و میناستیم

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت

اس کے علاوہ "رموز" میں بھی بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی تردید

کی ہے. فرماتے ہیں ؎

جوہر ما با مقامے بستہ نیست | بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفال جام ماست | رومی و شامی گل اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست | مرز و بوم او بجز اسلام نیست
زانکہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم | خویش را در خاکداں گم کردہ ایم
مسلم استی دل با قلیمے مبند | گم مشو اندر جہاں چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم | در دل او یاوہ گردد شام و روم
عقدۂ قومیت مسلم کشود | از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملّت گیتی نورد | بر اساس کلمۂ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطان دیں | مسجد ما شد ہمہ روئے زمیں
آں کہ در قرآں خدا او را ستود[1] | آں کہ حفظ جان او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش | لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکن آبا گریخت | تو گماں داری کہ از اعدا گریخت

---

[1] تلمیح بآیہ شریفہ واللہ یعصمک من الناس ۔ "اے نبی! خدا تجھے دشمنوں کی ایذا دہی سے محفوظ رکھے گا۔"

[2] دیگر اقوام میں سے بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ نبی کریمؐ کا ہجرت کرنا فی الحقیقت خوف و ہراس کی وجہ سے تھا، لیکن یہ ایک ایسا خیال ہے، جس میں کسی قسم کی روایتی تصدیق نہیں پائی جاتی، بھلا جس شخص نے ابتدا ہی سے یتیم ہوتے ہوئے بھی اعلان حق میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

فصہ گویاں حق زما پوشیدہ اند معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است این ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

(بقیہ گذشتہ صفحہ ۲۴۰) کسی طرح کی کوتاہی نہ کی ہو۔ جس نے بے یار و مددگار ہونے کی حیثیت سے تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا ہو، جس نے کفار کی حسین ترین عورتوں اور اُن کے حال و منال کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا ہو۔ جس نے بآوازِ بلند کہہ دیا ہو کہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر لا رکھنا اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ پر لا اتارنا بھی مجھے اپنے مشن کی تبلیغ سے مانع نہیں آسکتا۔ جس نے اندھیری اور مخدوش راتوں میں تنِ تنہا سفر کیا ہو، جو "احد" اور "بدر" جیسے نازک اور خطرناک موقعوں پر مٹھی بھر جماعت کے ساتھ ایک لشکرِ جرار کے مقابلہ میں پوری پامردی اور جرأت سے لڑا ہو۔ جس نے اپنی پیشانی زخمی اور دانت شہید کروائے ہوں جس کی بے پناہ قوتِ ارادی کے سامنے قیصر و کسریٰ کے تخت بھی محفوظ نہ رہ سکے ہوں اور جس نے اپنی زندگی اور موت کو سراسر خدا کی رضامندی کے تابع کر دیا ہو، اس کی نسبت کون ایک لمحہ کے لئے بھی یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس کا ہجرت کرنا کسی کے خوف سے تھا؟ سو ہمارے نزدیک اُس وقت کے ماحول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے واقعہ ہجرت کی اگر کوئی صحیح اور سچی تعبیر ہو سکتی ہے، تو وہ صرف یہی ہے کہ مکہ کے سرکش اور ظالم قریش آپ کو دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت سے روکتے تھے سو ان کا اس طرح سے حائل ہونا آنحضرت کو ناگوار معلوم ہوا۔ اور آپ نے مدینہ کو جہاں کے لوگ قدرتی طور پر متواضع اور حلیم الطبع واقع ہوئے تھے اور جنہیں اسی بنا پر "انصار" کا برگزیدہ لقب عنایت کیا گیا۔ اپنے مقصد کے لئے زیادہ موزوں سمجھ کر

(باقی اگلے صفحہ پر)

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو یعنی از قیدِ مقام آزاد شو
از فریبِ عصرِ نو ہشیار باش رہ افتد اے راہرو ہشیار باش

(بقیہ گذشتہ صفحہ ۱۲) اس طرف اپنا رخ کیا۔ بایں ہمہ ہجرت کوئی اچنبھے کی چیز نہیں ہے اور نہ ہی اسے کسی شخص کی بزدلی کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ اس کی تقدیس اور کبریائی پر انبیا اور صالحین کی تمام تاریخ شہادت دے رہی ہے۔ اُن میں سے بھی کوئی ڈرپوک نہیں تھا اور نہ ہی خدا کے کسی نبی کو ڈرپوک ہونا چاہیئے۔ خود لوط علیہ السلام نے ہجرت کی۔ ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ عیسیٰ علیہ السلام نے کی۔ خود یعقوب علیہ السلام اور ان کی تمام اولاد نے مصر کی جانب ہجرت کی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ہجرت کی۔ ان کے مقابلہ میں فرعون جیسے ظالم اور متشدد فرمانروا کو پے در پے شکستیں ہوئیں لیکن پھر بھی وہ اپنی سرکشی پر ڈٹا رہا۔ بالآخر موسیٰ نے بنی اسرائیل کو لے کر رات کی تاریکی میں ارضِ موعود یعنی شام کی طرف ہجرت کی۔ اس پر فرعون کی بدبختی اُسے تعاقب میں لائی، وہ دریائے نیل کے تھپیڑے کھاتا رہا اور خدائے واحد کے پرستار اس طوفان سے صحیح سالم نکل گئے۔

آج بھی جب اقوامِ عالم کی نظر عربوں کی انقلاب پسند طبیعت پر پڑتی ہے۔ اور ان کے بہادرانہ کارنامے اور اس بے بضاعتی کے ساتھ پے در پے فتوحات انہیں حیرت زدہ کر دیتی ہیں، تو سوال اٹھتا ہے کہ اس مافوق العادت اور معجز نما کامیابی کا بڑا سبب کیا ہے اور وہ کون سی چیز تھی جو اس بے پناہ طوفان کو اپنے دوش پر اٹھائے ہوا کی مانند ہر طرف اڑائے پھرتی تھی؛ اس پر انصاف پسند اور غیر متعصب مورخین صاف لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں کہ اس کا سبب خدائے واحد کا خوف تھا۔ اور بس، پھر سوال اٹھتا ہے کہ یہ تعلیم انہوں نے کہاں سے پائی؛ جواب ملتا ہے اپنے ہادی اور پیشوا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

اس سلسلے میں یہ چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں، مفہوم ان کا بھی تقریباً وہی ہے، جو مذکورہ بالا اشعار کا تھا، فرماتے ہیں ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اور چونکہ وطنیت کا مسئلہ دورِ حاضر ہی کی ایجاد ہے، اس لئے فرماتے ہیں۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یعنی جن چیزوں سے بظاہر وطنیت کا اثبات کیا جاتا ہے وہی فی الحقیقت ملتِ اسلامیہ کے لئے موت کا پیغام ہیں۔

اس سلسلۂ بحث میں یہاں قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب وطنیت اور قیدِ مقامی سے اسلام کو کسی طرح کا واسطہ نہیں ہے تو

نبی کریمؐ کو اپنے وطن سے محبت کس بنا پر تھی اور آنحضرتؐ نے ہجرت فرماتے وقت جوشِ الفت سے بے تاب ہو کر یہ کیوں فرمایا تھا کہ "اے سرزمین مکہ! میں تجھے تمام روئے زمین سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں اور صرف میں ہی نہیں بلکہ خدا بھی تجھے تمام روئے زمین سے زیادہ محبوب رکھتا ہے. پس کیا کروں کہ مجبور ہوں، ورنہ تیرے باشندے مجھے اس جگہ رہنے کی اجازت دیتے تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا"۔ [۱]

نیز جبکہ یہ انسان کا ایک اخلاقی جذبہ اور فطری حق ہے کہ وہ اپنی جائے پیدائش سے محبت کرے تو اسے مذموم فعل قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کیوں کی جاتی ہے ؟

صاحبِ اعتراض تو بڑا تشویشناک تھا، لیکن اسے حسنِ اتفاق کہیے کہ تحقیق و جستجو کے بعد "جاوید نامہ" میں اس کا حل بھی مل گیا. لکھتے ہیں ؎

آں کفِ خاکے کہ نامیدی وطن
ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتے است
زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر
نکتۂ بینی زمو باریک تر

---

[۱] حدیث کے الفاظ یہ ہیں: واللّٰہ انک لاحب ارض اللّٰہ الی و انک لاحب ارض اللّٰہ الی اللّٰہ ولو لا ان اہلک اخرجونی منک ما خرجت

گرچہ از مشرق بر آید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز دروں
تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
بر دمد از شرق خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری ست
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

اتنے نازک اور اہم مسئلے کا حل اس سے زیادہ بہتر پیرایہ میں ناممکن تھا اس ضمن میں جو مثال پیش کی گئی ہے وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک ایسی موزوں اور نادر مثال ہے کہ اُس سے مطلوبہ بحث کا کوئی خفیف سے خفیف پہلو بھی فوت ہونے نہیں پایا۔ فرماتے ہیں کہ آفتاب اگرچہ مشرق سے طلوع کرتا ہے اور اس بنا پر مشرق سے اس کو ایک طرح کی نسبت بھی ہے لیکن اس کا فیض و اثر اس قدر عام اور وسیع ہے کہ اس سے وہ ہر قسم کی حدبندی اور مقامی خصوصیت سے بالکل مستغنی ہو جاتا ہے۔

پھر یہ مسئلہ بھی کہ آنحضرت اور آپ کے صحابہ کرام کو اپنے وطن مکہ سے کس بنا پر محبت تھی، اسی ضمن میں حل ہو گیا۔ اس لئے کہ ؎

با وطن اہلِ وطن را نسبتے است
زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است

بیت الحرام یعنی مکہ مکرمہ بغیر کسی وقتی اور زمانی تخصیص کے تمام مسلمانانِ عالم کے لئے یکساں طور پر مرکز کا کام دیتا ہے اور قومی ضبط و تنظیم کے لئے ایک ایسے محسوس مرکز کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ جس سے ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کی مذہبی اور ملّی وحدت کی تجدید ہوتی رہے۔

مُساوات

اخوّتِ اسلامیہ اور وطنیت کی بحث کے ساتھ مساوات کا صحیح مفہوم بھی سمجھ لینا ضروری ہے، ورنہ دورِ حاضر کی عام روش جادۂ مستقیم سے منحرف ہونے کے باعث اس کو بھی ایک بالکل مختلف اور غلط صورت میں پیش کرتی ہے جس سے روحِ اسلامی کے فوت ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ ہم ذیل میں "رموزِ بےخودی" سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اسلامی مساوات کا صحیح نصب العین معلوم ہو سکے گا۔ یہ ایک حکایت ہے جسے ڈاکٹر صاحب اس طور پر قلمبند فرماتے ہیں ؎

بود معمارے ز اقلیمِ خجند
در فنِ تعمیر نامِ او بلند
ساخت آں صفت گر فرہاد زاد
مسجد از حکمِ سلطانِ مراد
خوش نیامد شاہ را تعمیرِ او
خشمگیں گردید از تقصیرِ او

آتشِ سوزندہ از چشمش چکید
دستِ آں بیچارہ از خنجر برید
جوئے خوں از ساعدِ[1] معمار رفت
پیشِ قاضی ناتواں و زار رفت
آں ہنرمندے کہ دستش سنگ سفت
داستانِ جورِ سلطاں باز گفت
قاضیِ عادل بدنداں خستہ لب
کرد شہ را در حضورِ خود طلب
رنگِ شہ از ہیبتِ قرآں پرید
پیشِ قاضی چوں خطا کاراں رسید
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام
اعتراف از جرمِ خود آوردہ ام
گفت قاضی فی القصاص[2] آمد حیات
زندگی گیرد بایں قانوں ثبات
عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست
خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آیۂ محکم شنید
دستِ خویش از آستیں بیروں کشید

---

[1] کلائی [2] ولکم فی القصاص حیوۃ یااولی الالباب (قرآن حکیم)

مدعی را تاب خاموشی نماند
آئیہ بالعدلِ والاحسان[1] خواند
گفت از بہرِ خدا بخشید مش
از برائے مصطفےٰ بخشید مش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوتِ[2] آئینِ پیغمبر نگر
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے ست
بوریا و مسندِ دیبا یکے ست

ویسے تو اول سے آخر تک یہ سارا بیان ہی اسلامی مساوات کا آئینہ ہے۔ لیکن ع

"خون شہ رنگیں تر از معمار نیست"

میں تو گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا۔ مساوات کی حقیقت کو اس سے زیادہ لطیف اور بلیغانہ انداز میں واضح نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر اس حکایت کی جو اصل روح ہے وہ یہ کہ ؎

پیشِ قرآں بندہ مولا یکے ست
بوریا و مسندِ دیبا یکے ست

اسلام ایک دینِ فطرت ہے، لہٰذا اس کے نزدیک مساوات کا نظریہ بھی اتنا ہی قوی اور پائدار ہونا چاہیئے تھا جو فطرت کے شایانِ شان

---

[1] ان اللہ یامر بالعدل والاحسان [2] دبدبہ۔ اقتدار

ہو، یہی وجہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہر صورت میں یہی فیصلہ ہو گا کہ ؎

تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

تاریخ اسلام خاص طور پر مساوات کی نسبت بھی ہمارے سامنے کیسے کیسے شاندار واقعات پیش کرتی ہے۔ خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ کا عہد اس مقصد کے لئے خاص طور پر ممتاز ہے، سچ پوچھو تو اسی برگزیدہ ہستی نے دینی اور سیاسی حیثیت سے اسلام کو ایک مستقل زندگی بخشی اور اسی کے روزمرہ افعال میں ہم جمہوریت اور مساوات کا صحیح نمونہ دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک دفعہ مالِ غنیمت کا بہت سا کپڑا آیا تو آپ نے غربا اور مہاجرین میں اُسے یکساں طور پر تقسیم کر دیا۔ اور خود بھی اپنا حصہ رکھا، یہ کپڑا صرف اتنا تھا کہ کوئی شخص ایک سے زیادہ قمیص نہ بنا سکا، کچھ عرصہ بعد وہ سب قمیصیں پھٹنا شروع ہو گئیں اور بعض نے ان میں پیوند بھی لگا لئے۔ لیکن ایک روز جب حضرت عمرؓ منبر پر تشریف لاتے تو انہوں نے بجائے پرانی قمیص کے اسی طرح کی ایک نئی قمیص زیب تن فرما رکھی تھی۔ مجمع میں سے ایک شخص نے جراَت کی اور خطبہ کے دوران ہی میں اُٹھ کر کہا: "ہمیں آپ کی حالت سے ناانصافی کی بُو آتی ہے، اس لئے ہم آپ کا وعظ سننے کے لئے تیار نہیں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے پوچھا: "کس طرح؟" اعرابی بولا: "یہ کیا وجہ ہے کہ ہماری قمیصیں پھٹ کر بے کار بھی ہو گئیں اور آپ کا کپڑا اب تک ختم ہی نہیں ہونے پایا؟" حضرت عمرؓ بولے۔ اس سوال کا جواب میرا بیٹا عبداللہ دے گا۔ اور وہ شاید تمہاری تسلی کے لئے

کافی ہو! عبداللہ باپ کا اشارہ پاکر اٹھا اور کہنے لگا۔ "حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی کی طرح والد ماجد کی قمیص پھٹ کر چیتھڑوں کی مانند ہو چلی تھی، مجھے یہ امر ناگوار معلوم ہوا۔ اور میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے حصّہ کا رکھا ہوا کپڑا بھی آنجناب ہی کو دے دوں، پس یہ اُسی کپڑے کی بنائی ہوئی قمیص ہے جو آپ اس وقت ملاحظہ فرما رہے ہیں۔"

اس پر وہ اعرابی دوبارہ اپنی جگہ پر اٹھا اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "ہاں، اب کہیئے ہم شوق سے سنیں گے۔"

اسی طرح ایک بار مدینہ میں نہایت شدت کا قحط ہوا۔ اگر اس وقت حضرت عمرؓ بھی دوسرے خودغرض اور عشرت پسند بادشاہوں کی طرح بے پروا ہو جاتے تو نہ معلوم انسانی آبادی کا کتنا بڑا حصہ موت کے گھاٹ اتر جاتا لیکن یہاں تو دل میں قومی درد تھا، خود جَو کا روکھا سوکھا ٹکڑا کھا لیتے تھے اور چہرہ صرف اس غم سے اترا جاتا تھا کہ ظل اللہ ہونے کی حیثیت سے فرائض کی بجا آوری میں کسی طرح کی کوتاہی واقع نہ ہو۔ اور لوگ اچھی سے اچھی غذا حاصل کر سکیں۔

خود عرب کے بہت بڑے متمولین میں سے ہیں۔ خلافت کا منصب ہاتھ میں ہے، لیکن جب بیت المقدس کا سفر پیش آتا ہے تو بغیر کسی دھوم دھام یا بغیر کسی فوج و لشکر کے ایک غلام کو ساتھ لے کر روانہ ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی اُسے یہ تلقین کی جاتی ہے کہ "بھائی اونٹ پر باری باری سے سوار ہونا ہوگا، یہ نہ ہو کہ تو میرے لحاظ سے اس تمام مسافت کو پاپیادہ

طے کرے اور اس بے انصافی کا وبال میری گردن پر ہو"۔ اتفاق دیکھو کہ اس سفر کا آخری پڑاؤ غلام کے حصہ میں آتا ہے، وہ بتقاضائے ادب حضرت عمرؓ کو مجبور کرتا ہے کہ اب آپ ہی کو سوار ہونا چاہیئے۔ لیکن آپ اس موقع پر بھی اُسے یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ" بھائی! اگر ان تمام تکلفات کا مقصد دشمن پر رعب بٹھانا ہے، تو سن رکھو کہ الھیبت من السماء یعنی رُعب اور دبدبہ سراسر خدا کی طرف سے ہے"۔

اسی پاکیزہ تعلیم کا نتیجہ ہے کہ جب ایک دفعہ شاہِ ایران عربوں کے پے در پے دھاووں سے تنگ آکر انہیں گفت و شنید کے لئے طلب کرتا ہے، اور وہ اُس کے پُرشوکت اور مرصع دربار میں پہنچتے ہیں، جہاں بڑے بڑے بہادر ہر دو جانب برہنہ ہتھیاروں کے ساتھ پرے جمائے کھڑے تھے، تو بڑے بڑے قیمتی قالینوں کو نیزوں کی نوک سے چھیدتے اور سب کو بے پروائی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بادشاہ کے پہلو میں تخت کے قریب جا بیٹھتے ہیں، اس پر حاضرینِ دربار سخت برہم ہوتے ہیں اور انہیں اس خلافِ معمول حرکت سے باز رکھنا چاہتے ہیں، اس پر عربوں کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ" ایامِ جاہلیت میں ہم بھی انہیں حماقتوں کا شکار تھے، لیکن اسلام نے آکر ہمیں اخوت اور مساوات کا ایک ایسا سبق پڑھایا ہے، جس سے ہم سب ایک ہو گئے ہیں، ہمارا نبی ہمیں یہ نہیں سکھاتا کہ ایک شخص خدا بن کر تخت پر بیٹھ جائے اور دوسرے تمام بندوں کی طرح اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہیں"۔

بادشاہ یہ الفاظ سنکر ندامت کے ساتھ اُن کی صداقت کا اعتراف کرتا ہے اور اس کے بعد گفت و شنید کا آغاز ہوتا ہے۔

اب افسوس اس امر کا ہے کہ جن قوانین کی پابندی سے اس مساوات کو زندہ اور قائم رکھا جا سکتا تھا، انہیں سے مسلمانوں نے آج روگردانی اختیار کر رکھی ہے جس کا لازمی نتیجہ قوم کا موجودہ مذہبی اور ملی انحطاط ہے۔

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

مساوات کی اس سے بہتر اور موثر تعلیم اور کیا ہو گی کہ اس کے رکنِ اساسی نماز کی فرضیت کو جہاد اور قتل و قتال کے موقع پر بھی ساقط نہ ہونے دیا جائے۔

اس ضمن میں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیئے کہ جس مساوات کو یورپ اس وقت پیش کرتا ہے، وہ اسلامی مقاصد کے سراسر منافی ہے، اشتراکیت اور ملوکیت موجودہ مساوات کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن حقیقت ان دونوں کی ایک ہی ہے۔ دونوں تن پروری اور استبداد کی تعلیم دیتے ہیں۔ دونوں کی سرگرمیاں مادّی اشتراک اور ظاہری نشو و نما تک محدود ہیں۔

دونوں کا مذہب اور ایمان سرمایہ کی حمایت ہی میں غرق ہے۔ دونوں ایک ہی چاہِ ضلالت کی طرف لے جانے والے ہیں، دونوں کی تعمیل ہلاکت اور موت کو آغوش میں لے لینا ہے، دونوں کی تشکیل و تولید، عقل و تدبر کی فسوں کاریوں سے ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل اسلامی مساوات کی بنا عشق اور سوزِ باطن پر ہے۔ روحانی ملاپ پر ہے، اس کا مقصد اخوت اور محبت کی تجدید کے سوا اور کچھ نہیں، یہاں کا معیارِ شرافت صرف تقویٰ اور حسنِ سلوک ہے۔

اسلام کا نظریۂ مساوات کوئی ایسی نئی اور سست بنیاد شئے نہیں ہے جس کا تعلق محض انسانوں کے تدبر اور ظاہری کاوش ہی تک محدود ہو، بلکہ یہ بنی آدم کا وہ فطری حق ہے جس سے خدا کو اپنی خلافت اور روحانی شرافت کا استحکام منظور تھا۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے اشتراکیوں کے نظریۂ مساوات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو قرآن مجید سے بہتر اس مسئلہ کا حل اور کوئی نہیں مل سکتا۔ قرآن مجید نے اقتصادی اعتبار سے بھی حقوق کی جو تقسیم کی ہے وہ اپنے اندر ایک متوسط اور غیر جانبدارانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس بارے میں قرآن مجید کا نظریۂ مساوات افراط و تفریط سے بالکل پاک ہے اور اس نے اعتدال کا رشتہ ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے ایک ایسا فیصلہ کیا ہے جو فطری اصول کے عین مطابق ہے اور جس کی تعمیل کسی شخص پر بھی گراں نہیں گذر سکتی۔

ملّتِ اسلامیہ کا یہی شرف و فضل ہے جس کا ذکر قرآن مجید نے ان

الفاظ کے ساتھ کیا۔ وکذالك جعلنکم امۃً وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ط اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک متوسط اور غیر مکلف طریقہ عطا کیا جس سے تم دوسری قوموں کے حکم مقرر ہو سکتے ہو۔

پس قرآن مجید کے سامنے جب مال کی تقسیم کا مسئلہ پیش ہوا تو اس نے انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہی فیصلہ کیا کہ اپنی حاجت بر آری کے بعد جتنا بھی کوئی خرچ کر تا ہے کر گزرے یسئلونك ماذا ینفقون قل العفوط یعنی "اے پیغمبر! یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ برادرانہ حقوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے بھائیوں کی کس قدر امداد کی جاتے۔ سو آپ فرما دیجئے کہ ذاتی طور پر ہر طرح سے خوش حال رہو، کھاؤ کماؤ، بیوی بچوں کا خیال رکھو، عزیز و اقربا کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آؤ، اور اس کے بعد جو کچھ تمہارے پاس بچ سکتا ہے، وہ دیگر غربا اور مساکین میں تقسیم کر دو، اس میں تم پر کوئی ناجائز تشدد نہیں۔"

لیجئے اشتراکیت کے سخت اور ناقابلِ تعمیل قوانین کی دھجیاں تو اسی فیصلے سے اڑ گئیں۔ اب اس کی وجہ اور حکمت ایک دوسرے مقام پر یوں بیان کر دی۔ ولا تؤتوا السفھاء اموالکم التی جعل اللّٰہ لکم قیاماً ط یعنی "نا اہل اور بے وقوف لوگوں کو وہ مال نہ دو جس پر تمہاری موجودہ اور آئندہ زندگی کا انحصار ہے۔"

یہ گویا معاشرت کا ایک نہایت اہم اور دائمی اصول ہے، جسے ان بلیغ الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ مقصد اس کا بھی یہی ہے کہ انسان کسی بے جا

سخاوت میں پڑ کر آیندہ کے لئے اپنی اقتصادی زندگی کو تباہ نہ کر بیٹھیں۔

پھر تعاون اور رواداری کی شرائط بھی کس قدر قرین قیاس اور محکم واقع ہوتی ہیں۔ فرمایا۔ تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ط" نیکی اور رفاہِ عام کے کاموں میں تو ایک دوسرے کی امداد ضرور کرو، لیکن برائی اور ضرر میں کسی کا ساتھ نہ دو" یہ ایک ایسا معیار ہے جس سے اگر ایک طرف دنیا میں حسن سلوک اور اعلیٰ اخلاق کی ترویج ہوتی ہے تو دوسری جانب تمام شر انگیز اور خلافِ امن طریقوں کا بھی انسداد ہو جاتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ معاشرت کے متعلق بھی اسلام ہی کا نظریہ مساوات ایک معقول اور معتدل نظریہ ہے' اسی سے دنیا میں امن قائم رہ سکتا ہے اور اسی سے انسانوں میں آپس کی صلح اور محبت کے جذبات استوار ہوتے ہیں۔

پھر اس کے خلاف بالشویک یا دنیا کی کوئی دوسری قوم جس مساوات کو پیش کرتی ہے' وہ فی الحقیقت ایک دھوکا ہے' فریب ہے اور اس کا مقصد غصبِ حقوق اور ظلم و تشدد کے سوائے اور کچھ نہیں' یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے بھی "جاوید نامہ" میں جمال الدین افغانی کی طرف سے ملت روسیہ کو جو پیغام دیا ہے' اس میں انہیں حقائق کی تشریح کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستہٖ او را اساسِ محکمے

داستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از امّ الکتاب
با سیہ فاماں یدِ بیضا کہ داد؟
مژدۂ لا قیصر و کسریٰ کہ داد؟[1]
در گذر از جلوہ ہائے رنگ رنگ
خویش را دریاب از ترکِ فرنگ
گر ز مکرِ غربیاں باشی خبیر
روبہی بگذار و شیری پیشہ گیر
چیست روباہی تلاشِ ساز و برگ
شیرِ مولا جوید آزادی و مرگ
جز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بذکر
ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب
کارِ جان است ایں نہ کارِ کام و لب
خیزد از وے شعلہ ہائے سینہ سوز
با مزاجِ تو نمی سازد ہنوز

---

[1] اس میں بھی سرمایہ داری اور ملوکیت کی تردید ہے۔

اے شہیدِ شاہدِ رعنائے فکر
با تو گویم از تجلّی ہائے فکر

اس کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نہ صرف انسان کی روحانی ضروریات ہی کو پورا کرتا ہے، بلکہ اقتصادی حیثیت سے بھی یہ ایک بہترین دستور العمل ہے، یہ سود کو حرام قرار دیتے ہوئے سرمایہ داری کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ شکستہ اور ناچار لوگوں کا حامی ہے اور قرضِ حسنہ سے زیادہ اچھی چیز اس کے نزدیک اور کوئی نہیں ہے

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن
کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعؑ بندہ و ملکِ خدا ست

ؑ یہاں "متاع" اور "ملک" کے مفہوم میں جو فرق پیشِ نظر رکھا گیا ہے اس کا سمجھ لینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ لغوی حیثیت سے "متاع" اس فائدے کو کہتے ہیں جو عارضی اور غیر مستقل طور پر حاصل کیا جائے۔ اور بخلاف اس کے "ملک" کا مطلب یہ ہے کہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

بندۂ مومن امین حق مالک است
غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است

(بقیہ گذشتہ صـ۲۵۷) کوئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک شے کا مختار اور والی بن بیٹھے. سو ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے اور کسی کو حاصل نہیں، سچ پوچھو تو تمام اس قسم کا ظلم و ستم جو سرمایہ داروں اور اونچے کلہ والے "چودھریوں" کی طرف سے زیردستوں پر واقع ہوتا ہے، اس کی بنا ہی اس غلط فہمی پر ہے کہ ہم اس جاگیر کے مستقل مالک ہوں گے، ان فرعونوں کو شاید فرعونِ مصر کا وہ عبرتناک انجام معلوم نہیں کہ کل تک وہی اپنے آپ کو انسانوں کی قسمت کا مختار اور مالک قرار دیئے ہوئے تھا اور آج اُس بدبخت کی لاش کا یہ حشر ہے کہ نیل کی موجیں آئے اور اُس کی فوج کو ہر طرف سے بلے دردی کے ساتھ پیٹ رہی ہیں لیکن ان کی اس آہ و بکا اور شور و شیون کو سننے والا کبھی کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ "بالِ جبریل" میں بھی اسی مقصد کو "الارض للہ" کے عنوان سے ظاہر کر دیا ہے۔ وہ نظم حسب ذیل ہے ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

وہ خدایا یہ زمیں میری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں[1] | قریہ ہا از دخل شاں خوار و زبوں
آب و نانِ ماست از یک مائدہ | دودۂ آدم کنفسٍ[2] واحدہ

یعنی بنی آدم کی تخلیق صرف ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے۔ اس لئے مساوات اور ہمدردی کا رشتہ کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند | کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار | دگر عضو ہا را نماند قرار

تو کز محنت دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

یہاں سے پھر قرآن مجید کی صفات اور کمالات کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اعجازی قوت دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ اس لئے یہی اس قابل ہے کہ اسے اپنا راہبر قرار دیا جاتے ؎

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست | نقشہائے کاہن[3] و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است | ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود | جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود
مثل حق پنہاں و ہم پیداست ایں | زندہ و پایندہ و گویاست ایں
اندرو تقدیر ہائے شرق و غرب | سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

---

[1] تلمیح بآیہ شریفہ ان الملوک اذا دخلوا قریۃً الخ
[2] " " ماخلقتکم ولا بعثکم الا کنفسٍ واحدہ
[3] کاہن بمعنی جادوگر۔ پاپا۔ پاپائے روم۔ عیسائیوں کے پیشوا مراد ہیں۔ (باقی صفحہ ۲۶۱ پر)

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ   ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ
آفریدی شرع و آئینے دگر   اندکے با نورِ قرآنش نگر
از بم و زیرِ حیات آگہ شوی
ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی

تو گویا اس تمام تقریر کا حاصل یہ ہوا کہ اسلامی مساوات ہی سچی مساوات ہے اور اس کے علاوہ موجودہ زمانہ میں قرآن حکیم کے فیصلے سے انکار کرتے ہوئے جو قوم بھی مساوات کا دعویٰ کرتی ہے، وہ ہرگز قابلِ اعتماد نہیں اور مسلمانوں کو اس سے اپنا دامن بچا کر رکھنا چاہیئے ؎

از فریبِ عصرِ نو ہشیار باش   رہ فتد اے راہرو ہشیار باش

(بقیہ گذشتہ صفحہ ۲۵۹) مطلب یہ کہ قرآن کے نزول سے تمام گزشتہ چیزیں منسوخ قرار دی گئیں۔ حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ وہ علمائے یہود سے مل کر شریعت موسوی کی نسبت کچھ نہ کچھ دریافت کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بیٹھے ہوئے توراۃ کے بعض اوراق کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کہ ابوبکر صدیقؓ نے انہیں زور سے جھنجوڑا حضرت عمرؓ نے جو اوپر کو نظر اٹھائی تو خاتم النبیینؐ کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا اور آنکھیں انگاروں کی مانند سرخ تھیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ فوراً سنبھلے، تورات کو چھپا دیا۔ اور معافی کے خواستگار ہوئے، وجہ تو وہ سمجھ ہی چکے تھے۔ البتہ بے احتیاطی ضرور ہوئی۔ اس پر نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا۔
"اے عمر! قرآن کے بعد تمام آسمانی کتابیں منسوخ ہیں، اور تجھے معلوم نہیں کہ آج اگر میرا بھائی موسیٰ بھی موجود ہوتا تو اسے بھی میری متابعت اور حلقہ بگوشی کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔"

بایں ہمہ اگر یورپ اس پر اصرار کرے اور ملت روسیہ اس میں زندگی اور خوشی کے آثار دیکھے۔ تو یہ ان کی غلطی ہے۔ نفسیاتی اور عملی نقطہ نگاہ سے بھی تو یہ تجویز بالکل ناکارہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ مال جب انسانی آبادیوں میں یکساں طور پر تقسیم ہونے لگے گا اور اس میں کسی کی تفریق یا کسی کا امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ تو اس سے بددلی اور کاہلی پیدا ہو گی، یا ترقی اور جوش و خروش لازمی امر ہے کہ اس طرح حقدار اور سرگرم لوگ سُست اور نااہل لوگوں کو اپنے مال و دولت کا شریک پا کر خود بھی افسردہ اور معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ جب مسلمانوں میں صرف زکوٰۃ کا مصرف ایک بہت بڑے طبقے کو اپاہج اور بے کار بنا سکتا ہے۔ تو کیا اشتراکیت جیسی باضابطہ وسیع اور منظم تقسیم پر انسانی آبادیوں میں ہلاکت اور محرومی کے آثار نمایاں نہیں ہوں گے؟ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ دنیا کو ترقی اور اوج کی طرف لے جانے کی بجائے اُسے تنزل اور پستی کا سبق پڑھائے گا۔ خدا نے دنیا کی رونق زیادہ تر ہنگامہ پروری اور جوشِ عمل پر منحصر رکھی ہے اور یہ چیز ان مقاصد کے سراسر منافی ہے، خلافِ فطرت امر میں نہ آج تک کوئی کامیاب ہوا ہے، اور نہ آئندہ ہو سکے گا، خدشہ ہے کہ یورپ کا اٹھایا ہوا یہ فتنہ خود اس کے لئے خانہ جنگی اور تباہی کا موجب نہ بن جائے۔ یورپ ہزار کوشش کرے اس میں کوئی مستقل استحکام پیدا نہیں کر سکتا۔ علامہ اقبال تو پہلے ہی فرما چکے ہیں ؎

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

اور اسی لئے پیشین گوئی بھی کر دی ؎

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اُسے زنجیر پا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگین قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

باوجود ان باتوں کے سوشلزم[1] کا نظریہ چونکہ موجودہ زمانہ کے اجتماعی

---

[1] لفظ تو صاحب نہایت خوش آیند اور دلربا واقع ہوا ہے. گویا اعلانِ حقوق انسانی" یا "مساوات" کا مرادف ثابت ہو رہا ہے' لیکن اسے بھی یورپ کی دیگر عیاریوں کی طرح ایک عیاری کہا چاہیئے کہ سادہ لوح انسانوں کی خاطر ایک سنہری جال تیار کر دیا اور ایک ایسی اصطلاح وضع کی جس کا تلفظ ہی ماشاءاللہ پیانو کی سی موسیقی پیدا کرے۔
آخر پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) میں کون سی صداقت تھی ؎

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

جو یہ نیا بھوت اور سر پر سوار ہو گیا "شخصیت" کے خونیں تاثرات ملک میں ہر طرف موجزن

(باقی آگے صفحہ پر)

سیاسی، تمدنی، افکار بہ شدت سے اثر انداز ہو رہا ہے اور لوگ قدرتی طور پر اس کے قبول کرنے میں خوشی اور تسکین محسوس کرتے ہیں لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت موسیو لیبان کے نتائج اور تفکرات کو بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے، چنانچہ وہ اس کی قبولیت اور ترقی کے باوجود اسے یورپ کے حق میں ایک عظیم الشان خطرہ قرار دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"تاریخی حیثیت سے شاہانہ حکومت کا زمانہ یا تو تمدن کے شباب کی حالت میں شروع ہوتا ہے، یا اس کی بنیادیں تمدنی انحطاط کے دور میں پڑتی ہیں، آج بھی خود مختارانہ طرزِ حکومت ایک دوسرے قالب میں جلوہ گر ہوا ہے۔ یعنی اس کا ظہور اشتراکیت کی صورت میں ہو رہا ہے، اشتراکیت درحقیقت افراد کو فنا فی السلطنت کر دیتی ہے۔ بلکہ وہ شاہانہ طرزِ حکومت سے بھی زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ ایک بڑے سے بڑا استبداد پسند بادشاہ بھی انجام کار سے ڈرتا ہے، لیکن جماعتی حکومت کو اس کا ذرہ برابر بھی خوف

(بقیہ گذشتہ صفحہ ۲۶۲) دکھائی دیتے ہیں تاہم اسے بھی انگریز کی بھولی طبیعت "جمہوریت" سے تعبیر کرتی چلی جاتی ہے ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

پس "سوشلزم" کے معنوی تضاد کو بھی اسی پالیسی کا سبب قرار دے لیجئے کہ جو لائحہ عمل سوسائٹی کے لئے تباہی اور انتشار کا باعث ہے۔ اُسی کو امن اور اتحاد کا جامہ پہنا کر ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ طارق

نہیں ہوتا، اس وقت اشتراکیت تمام خطرات سے زیادہ یورپین قوموں کی ہستی کو دھمکی دے رہی ہے، قوم پر دوسرے موثرات اثر کر چکے ہیں، اور اب وہ ان کے تنزل کا سامان کر رہی ہے اور بالآخر اس کے ذریعہ سے یورپین تہذیب کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس کے خطرات اور اس کے اثرات کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ لوگ اس شدت کے ساتھ اس کی طرف مائل ہو رہے ہیں کہ خود اس تعلیم کو چھوڑتے جاتے ہیں، جس نے اشتراکیت کو بیدار کیا ہے، جو لوگ زندگی کے مصائب میں مبتلا ہیں اور اس زمانہ کے تمدن نے جو مالی مشکلات پیدا کر دی ہیں، اُن سے واقف ہیں، وہ اس مذہبِ جدید کو علانیہ قبول کر رہے ہیں، ان لوگوں کی تعداد اگرچہ اب بھی غیر محدود ہے، لیکن چند ہی دنوں میں آسمانوں کی وسیع فضا بھی اس سے بھر جائے گی، جو لوگ مصائبِ زندگی کو برداشت نہیں کر سکتے، ان کو وہ جنت کی صورت میں نظر آئے گی۔ یعنی وہ جنت جو پہلے صرف مسجدوں اور گرجوں کے جھروکوں سے نظر آتی تھی۔ اس آنے والے مذہب کے شیدائی بڑھتے جاتے ہیں اور عنقریب اس پر قربانیاں چڑھائی جائیں گی، اور اس حالت میں وہ ایک مذہبی عقیدہ ہو جائے گی جس کی آواز سے تمام قوم لرز اٹھتی ہے۔"

تہذیبِ حاضر

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ علامہ اقبال کی تصریحات کے مطابق موجودہ

تہذیب ہماری زندگی کے لئے کس حد تک مفید ہے پس جیسا کہ ان کی تعلیم سے معلوم ہوتا ہے. یہ تہذیب بجائے مفید ہونے کے ہمارے لئے تباہی اور بربادی کا سامان پیدا کر رہی ہے، اس تہذیب کا تعلق زیادہ تر ظاہری آرائش وزیبائش سے ہے، روحانی زندگی کے ساتھ اسے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ تہذیب فقط عناصر کو اپنا خدا سمجھتی ہے، اس کی تمام کوششیں مادی ترقی اور جسمانی زور و قوت ہی کے لئے وقف ہیں، عمل اور اخلاق کی اصلاح سے اسے کوئی تعلق نہیں، زندگی کا حقیقی نشو و نما اور فضائلِ انسانی کی تکمیل عشق کے احساس سے ہے، لیکن یورپ اس چیز سے بالکل بیگانہ اور ناآشنا ہے، وہ صرف عقل و تدبر کو اپنا پیشوا خیال کرتا ہے لیکن یہی عقل اس کے لئے بے شمار مصیبتوں اور پریشانیوں کا سبب بن گئی ہے وہ مادی اسباب میں الجھ کر زندگی کی سچی راحت کھو بیٹھا ہے، اس کی اپنی کوششیں اس کے لئے بلائے جان ثابت ہو رہی ہیں، اُس نے عناصر کو مسخر کر تو لیا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ خوب اچھی طرح سے مسخر کیا ہے. لیکن اس سے بھی سیاسی حرکت کچھ اس طور پر اپنے درجۂ اعتدال سے تجاوز کر گئی ہے کہ وہ خود اس کے خطرات کو اب شدّت کے ساتھ محسوس کرنے لگا ہے [1]

بس اس درد کا مداوا سوزِ عشق کے سوا اور کوئی نہیں اور عمل کے لئے

---

[1] چنانچہ "تخفیف اسلحہ" کا مسئلہ بھی جس پر آج کل اس شدومد سے بحث کی جا رہی ہے، انہیں خطرات کی ایک نمایاں صورت ہے۔

بھی اگر کوئی چیز اس وقت ہمیں چراغ راہ کا کام دے سکتی ہے تو وہ فطرت کی اطاعت اور عشق کا احساس ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف نے "پیام مشرق" میں انگریزوں کو جو پیغام دیا ہے، اس میں انہیں حقائق کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال گشود است گرفتار تر است
برق را این بجگر می زند آن رام کند
عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ
آنچہ در پردہ رنگ است پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تر است
دانش اندوختۂ دل از کف انداختۂ
آہ ازاں نقدِ گرانمایہ کہ در باختۂ

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

چارہ این است کہ از عشقِ مرادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

اسی کتاب میں دوسری جگہ یورپ کی موجودہ حالت کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں ؎

جلوۂ ادبے کلیم و شعلۂ ادبے خلیل
عقلِ ناپروا متاعِ عشق را غارت گر است

پس آپ نے دیکھا، کہ ہر جگہ عشق ہی کی تائید ہو رہی ہے اور محض عقل کو تہذیب اور انسانیت کی غارت گر ثابت کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح "زبورِ عجم" میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را
جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی

اور پھر ؎

قدحِ خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا
ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد

اس ضمن میں "بانگِ درا" کے یہ چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

یعنی ؎

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

لیکن ہمارا نوجوان طبقہ جس خطرناک صورت میں اس تہذیب کو قبول کر رہا ہے وہ بھی ایک عبرت کی چیز ہے۔ "جاوید نامہ" میں حضرت علامہ اپنے فرزند ارجمند جاوید کو مخاطب فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

گر خدا سازد ترا صاحب نظر — روزگارے را کہ می آید نگر
عقلہا بے باک و دلہا بے گداز — چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن، دین و سیاست عقل و دل — زوج زوج اندر طوافِ آب و گل[1]

اور پھر اسی تہذیب کا اثر ہے کہ ؎

نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ — شستہ رو، تاریک جاں روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید — چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید!
ناکساں منکر ز خود مومن بغیر — خشتِ بند از خاکِ شاں معمار دیر!

"اسرار" میں پھر انہی کمزوریوں اور خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

قیمتِ شمشادِ خود نشناختی — سروِ دیگر را بلند انداختی
مثلِ نے خود را ز خود کردی تہی — بر نوائے دیگراں دل می نہی
اے گدائے ریزہ از خوانِ غیر — جنسِ خود می جوئی از دکانِ غیر

[1] مادیات۔ ظواہر

بزمِ مسلم از چراغ غیر سوخت مسجدِ او از شرارِ غیر سوخت
از سوادِ کعبہ چوں آہو رمید
ناوکِ صیاد پہلوئش درید

یعنی قوم کی عزت بھی اُسی وقت تک قائم تھی جب تک اُس نے احساسِ خودی کو برقرار رکھتے ہوئے ملّت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا. لیکن جوں ہی اس سے غفلت برتی اور دوسری قوموں کی تہذیب کو اپنا دستور العمل بنایا، قومی وقار کے ساتھ انفرادی عزت بھی خود بخود رخصت ہوگئی. اور یہ خدا کا ایک ایسا قانون ہے جس سے کوئی شخص بھی آزادی کا دعویٰ نہیں کر سکتا ؎

خرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس کے بعد "جاوید نامہ" میں پھر ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

شرق را از خود برد تقلیدِ غرب بایدایں اقوام را تنقیدِ غرب
قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست

علم وفن را اے جوانِ شوخ وشنگ — مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست — ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست

فکرِ چالاکے اگر داری بس است
طبعِ درّاکے اگر داری بس است

ان اشعار میں بھی نوجوانوں کی تراش خراش اور روزمرہ زندگی کا ذکر کیا گیا ہے، فرماتے ہیں کہ تم جو یورپ کی تقلید پر مٹ رہے ہو، ان کی ترقی اور اقبال کا موجب یہ سوٹ بوٹ اور ہیٹ وغیرہ تو نہیں ہیں۔ اور نہ ہی لامذہبیت نے انہیں اس مرتبے تک پہنچایا ہے، بلکہ وہ تو اپنے علم وہنر اور غور وتدبر سے سرفراز ہیں، تو پھر تم ان حقیقی کمالات سے محروم ہوتے ہوئے بھی کس چیز پر نازاں ہو؟ ہمیں لازماً یہاں اکبرؔ مرحوم کی یہ رباعی دہرانا پڑے گی ؎

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں پوچھتا ہوں تجھ سے اے ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

تو حاصل یہ ہوا کہ ؎

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبرؔ
اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو؟

الغرض ہمارے اعمال اور اخلاق کی تہذیب و اصلاح کا بہترین دستور العمل قرآن مجید ہے اور اسی کے لئے ڈاکٹر صاحب تلقین بھی فرماتے ہیں ؎

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ　　مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ
گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ　　من بجز عبرت نگیرم از فرنگ
اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو

حقیقتِ موت وحیات

اس موضوع پر بھی علامہ اقبال کی تصنیفوں میں بکثرت مثالیں ملیں گی. اور موت و حیات کی نسبت جو کچھ بھی آپ نے فرمایا ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہے اور حق تو یہ ہے کہ اپنے معمول کے مطابق اس بحث میں بھی اسلامی فلسفۂ حیات سے سرِ مُو تجاوز نہیں کیا ہے، ذیل میں ہم چند مثالوں سے اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں.

"پیامِ مشرق" میں زندگی کے بے پایاں ہونے کا ذکر اس طور پر کیا گیا ہے.

چہ غم داری حیاتِ دل زدم نیست
کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ
اگر دم رفت دل باقی ست غم نیست

اس کے بعد "بانگِ درا" میں "فلسفۂ غم" کے زیرِ عنوان بھی زندگی اور موت کی حقیقت کو بہترین انداز میں روشن کیا گیا ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چُور

نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجراں قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

خوبیٔ مفہوم کے علاوہ ان اشعار کی ادبی حیثیت پر بھی ذرا غور فرمایئے اول تو زندگی کو ایک ایسی ندی سے تعبیر کرنا جو آسمانی بلندیوں سے نغمہ و سرود پیدا کرتی ہوئی نیچے اترتی ہے، ہی کتنا موزوں اور لطیف استعارہ

تھا، چہ جائے کہ پھر اُسی کے مختلف مدارج اور کیفیتوں کا ذکر اس طور پر کیا جائے کہ نیچے گرتے وقت وہ ایک صاف و شفاف آئینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جو حور کے رخسار سے بھی زیادہ روشن ہے، پھر وہی آئینہ یکایک چٹانوں پر گرتا اور گر کر پاش پاش ہو جاتا ہے، پھر اس افتاد سے پانی کے جو مختلف قطرے نمایاں ہو جایا کرتے ہیں، انہیں اور آبدار موتیوں سے تشبیہ دینا اور پھر جگمگاتے ہوئے تاروں سے یاد کرنا اور اس کے بعد دوبارہ قطروں کی اس منتشر دنیا کو ایک جگہ فراہم کرتے ہوئے سیماب اور تار سیم جیسی نادر تشبیہات سے تعبیر کرنا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری دنیوی زندگی اور عالم برزخ کے درمیان موت کی وجہ سے جو معمولی سا وقفہ پیش آجایا کرتا ہے، اُسے "دو قدم" جیسے لطیف اور نازک اشارے سے حل کر دینا نہ صرف علم النفس اور فلسفۂ حیات ہی کا بہترین انکشاف ہے، بلکہ شاعری اور آرٹ کی رُو سے بھی یہ بیان ایک لاثانی بیان ہے۔

پھر "فلسفۂ غم" ہی کے بعض دیگر اشعار میں زندگی کی بقا اور عشق کے دوام پر کیسی عمدہ اور محکم دلیل پیش کرتے ہیں۔ یہ تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں
ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی

یہ دلیل جزوی حیثیت میں بجائے خود نہایت موثر اور معقول واقع ہوئی ہے لیکن اگر آپ کو زندگی کے تسلسل پر اس سے بھی زیادہ ہنگامہ پرور اور رقت انگیز دلائل دیکھنا منظور ہوں، تو ڈاکٹر صاحب کی وہ نظم ملاحظہ فرمایئے۔ جو "والدۂ مرحومہ" کی یاد میں گویا خونِ دل سے لکھی گئی ہے، یہ تاثر چونکہ ایک نہایت غم انگیز سانحہ کے ماتحت عمل میں آیا ہے، اس لئے مضامین کا سوز و گداز بھی عام حالتوں کی نسبت کہیں زیادہ بلند ہے، شاعر نے گو ابتداءً موت کے ہاتھوں مجبوری اور بے چارگی کا اظہار کیا ہے، لیکن بعد میں حیاتِ ابدی کے غیر مختتم فیض سے مسرور ہو کر دنیوی حادثات کو ایک عادی چیز سمجھ کر فراموش کر دیتا ہے، اور انسانی روح کی عظمت و بزرگی پر یوں گوہر ریزی ہوتی ہے ؎

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ! غافل، موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب
موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
اس روش کا کیا اثر ہے ہیبتِ تعمیر پر؟
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر!
فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو
آہ! سیمابِ پریشاں انجمِ گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں ممنونِ شب ہے جن کا سوز
عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے
پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثالِ شمعِ روشن محفلِ قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے
جس کی نادانی صداقت کے لئے بیتاب ہے
جس کا ناخن سازِ ہستی کے لئے مضراب ہے
شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لئے مجبور ہے

سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح

لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ

سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سینکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے

خفتگانِ لالۂ زار و کوہسار و رود بار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار
یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انسان کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح؟

غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ اشعار میں زندگی کے دوام پر سات مستقل دلیلیں قائم کی گئی ہیں اور ان دلیلوں کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

(۱) پہلی دلیل تو یہ ہے کہ جب کائناتِ عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز زندگی سے ایک قدرتی انس رکھتی ہے اور چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک یہ جذبہ موجود ہے۔ تو پھر قدرت کے نزدیک یہ چیز کیوں محبوب نہ ہوگی، اور وہ اس کا ایک عارضی سا تماشا دکھا کر ہمیشہ کے لئے اسے کیونکر نیست و نابود کر سکتی ہے؟

(۲) پھر دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر موت کے ہاتھوں زندگی جیسی عزیز شے کا نقش ہمیشہ کے لئے مٹ سکتا اور محبت و مودّت کے وہ فطری اور پیدائشی رشتے جو امتدادِ زمان سے ایک طور پر ہماری طبیعتِ ثانیہ قرار پا چکے ہیں، اس طور پر یکایک منقطع ہو کر آئندہ کے لئے ہمیں مایوس بنا دیتے تو نظامِ کائنات موت جیسی ظالم اور نامبارک شے کو اس آزادی اور کثرت سے متصرف ہو جانے کا اختیار ہرگز نہ دیتا۔

(۳) پھر تیسری دلیل یہ ہے کہ گو موت کا دستِ ستم ہر لمحہ دراز ہوتا رہتا ہے اور اس عمل میں اس کی جانب سے کبھی کسی رحم یار کاوٹ کا اظہار نہیں ہوا۔

تاہم یہ چیز زندگی کے تسلسل کو ہرگز متاثر نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارا روز کا سونا، ہمارے زندہ اور موجود ہونے میں کوئی شک وشبہ پیدا نہیں کرتا۔

(۴) پھر چوتھی جگہ دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ نقش کا بجائے خود ناپائدار ہونا زندگی کے مٹنے یا منقطع ہو جانے کا کوئی معقول قرینہ نہیں اور مشاہدہ کی رُو سے دلیل یہ بیان ہوتی ہے کہ ہوا خود ہی سطحِ آب پر بے شمار حباب تعمیر کرتی ہے۔ اور اپنے ہی جھونکے سے انہیں فنا بھی کر ڈالتی ہے، تو اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ہوا میں حُباب کو دوبارہ تعمیر کر سکنے کی صلاحیت نہ ہوتی، تو وہ اس بے دریغی سے اپنی بنائی ہوئی شے کو برباد ہی کیوں کرتی؟ اور اگر وہ اپنے تصرف سے اس کو دوبارہ عالمِ وجود میں لاتی ہے، تو اس سے اس کی قوتِ تعمیر اور جذبۂ تخلیق پر اعتراض کی کیا وجہ؟

(۵) پھر پانچویں دلیل یہ ہے کہ جب ستارے ایک ادنیٰ مخلوق ہو کر ہر روز آسمان پہ ظہور پذیر ہوتے ہیں، اور طلوعِ صبح سے ان کا وجود حقیقتاً مٹ نہیں جاتا، تو انسان جیسی برتر اور اعلیٰ ہستی جو مقاصد کی بزرگی میں فرشتوں پر ترجیح رکھتی ہے، موت کے عارضی وقفہ سے زندگی کا دوام کیونکر زائل کر دے گی؟

اس تخیل کو ایک انگریزی شاعر نے یوں ادا کیا ہے ؎

Yesternight the sun went hence,
and yet is here today;

He hath no desire nor sense,
Nor half so short a way,
Then fear not me,
Then believe that I shall make
Hastier journeys, since I take
more wings and spurs than he

یعنی جب آفتاب کی یہ کیفیت ہے کہ وہ باوجود کسی قسم کا شعور نہ رکھنے کے اور باوجود اس قدر طول طویل مسافت کے جو اُسے روزانہ طے کرنا پڑتی ہے آج پھر پوری آب و تاب سے وہیں کھڑا ہوا دمکتا ہے جہاں کل تھا، تو کیوں "انسان" اس عارضی موت کے بعد ایک دائمی زندگی سے مالامال نہ کیا جائے گا جو اس پرواز کے لئے اپنے پاس کافی سے زیادہ سامان بھی رکھتا ہے؛ اس کے لئے تو "ذوقِ حیات" ہی ایک ایسی مسرت ہے جو اسے آیندہ زندگی کی طرف بے اختیار جذب کئے لیتی ہے ؎

اڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا؟

(۶) پھر چھٹی دلیل یہ ہے کہ پھولوں کا بیج زیرِ خاک رہ کر بھی کیچڑ اور پانی وغیرہ کی سردی سے اپنا سوزِ حیات کھو نہیں بیٹھتا اور ذوقِ نمو سے مجبور ہو کر بصورتِ گل نمودار ہوتا ہے۔ سو یہی مثال انسان کی ہے کہ وہ لحد میں دب کر بھی روح کے دوام کا حق کسی طرح ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں۔

بحوالہ قرآن ذکر کیا گیا ہے کہ قریش میں سے ایک ملحد اور دہریہ شخص انسانی جسم کی چند بوسیدہ ہڈیاں نبی کریمؐ کے سامنے لایا اور انہیں انگلیوں میں مسل کر ذرات کو ہوا میں اڑاتے ہوئے بولا "پیمبرِ خدا، کیا یہی وہ سامان ہے جس سے انسان دوبارہ پیدا کیا جائے گا؟"

جواب ملا "یہ اس نطفے سے بری شے نہیں جس سے تو پہلی مرتبہ ماں کے شکم میں پیدا کیا گیا تھا۔"

حاضرین بے اختیار ہنس دیئے اور معترض اپنا سا منہ لے کر خاموش چلا گیا۔

(۷) پھر اس ضمن میں ساتویں اور آخری دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ جب صبح کا جلوہ نما ہونا تمام حیوانات کے لئے بیداری اور جنبش و حرکت کا پیام رساں ہے، تو قبر کی تاریک اور ہولناک شب ایک نہ ایک روز مسرت کی ہنگامہ آرائیوں، اور نورِ فطرت کی تجلیوں سے کیوں روشن و معمور دکھائی نہ دے گی؟ ؎

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر صبح شام
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

ڈاکٹر صاحب بال جبریل میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بے زار ہو اپنی کرن سے

اسی طرح بالِ جبریل کے "ساقی نامہ" میں زندگی اور موت کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ بھی ان تاثرات اور حقائق کا موید ہونے کے علاوہ اندازِ بیان میں گزشتہ اشعار سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ ؎

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات[۱]
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس
زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

الغرض یہاں بھی زندگی کو ایک دائمی اور ابدی شے قرار دیا گیا ہے، پھر اسی مفہوم کو ایک نئی تمثیل سے واضح فرماتے ہیں اور وہ یہ کہ ؎

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار
اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں ہزار

گویا اس بحرِ ہستی میں موت کا ظہور اس موج سے زیادہ وقعت

---

[۱] ہر دو اشعار گویا غالبؔ کے اسی فلسفۂ حیات کے حامل ہیں کہ ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

نہیں رکھتا، جو ذرا سی دیر کے لئے سطحِ آب پر نمایاں ہوتی اور پھر فوراً اسی کے اندر محو ہو جاتی ہے یعنی موت بجائے خود اتنی بے بود اور عارضی سی چیز ہے کہ اس کے اجزا بھی زندگی کی وسعتوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں، یہ بالکل اسی قسم کا استدلال ہے ؎

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

یعنی ہماری زندگی بھی ذوقِ حیات کا ایک نامکمل نقش ہے۔ لیکن اس نقش کی تکمیل اسی وقت ہو گی، جب یہ اپنی ناقص اور موہوم صورت کو چھوڑ کر اپنے اسی حقیقی لباس میں جلوہ نما ہو گا جو اس کی غایتِ تخلیق ہے۔ "غنچہ" اور "گل" یہ دو لفظ اس لطیف احساس کے ترجمان ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب ایک کشتی کو سطحِ آب پر پوری تیزی سے رواں پاتے ہیں لیکن جب وہ نظر سے غائب ہو جاتی ہے، تو اس سے انسانی حیات کے متعلق ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

جہازِ زندگی آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

گویا ؎

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

یہ تشبیہات اور یہ دلائل بجائے خود نہایت عمدہ اور قوی ہیں اسی میں ایک مزید بصیرت پیدا کرنے کے لئے ایک انگریزی نظم کا ترجمہ بھی پیش کئے دیتا ہوں۔ شاعر کہتا ہے :۔

"ہماری زندگی کو پھولوں اور پتوں کی زندگی پر قیاس نہ کرو، ورنہ ہمارے دل میں موت و حیات کی نسبت یہ مسلسل کش مکش کیوں جاری ہے؟ اور ہماری روح اس درد کو کیوں اس شدت سے محسوس کر رہی ہے ہماری حالت تو یہ ہے کہ اپنے سے گذر کر معمولی سے معمولی چیزوں کی موت بھی ہم پر نہایت گہرا اثر کرتی ہے۔ پھر کیا تمہارے خیال میں ہم بھی دیگر کیڑوں مکوڑوں کی طرح ہمیشہ کے لئے خاک سے مل کر خاک ہو جائیں گے؟ ہرگز نہیں۔

فطرت ایسی تنگدل یا بخیل تو نہیں ہے کہ ایسے خوبصورت نقش اور اس قدر مخصوص ہستی کو یوں ہی ضائع کر دے۔

کیا ہوا اگر موت اس قدر عام اور خوفناک دکھائی دیتی ہے۔ کیا ہوا اگر اس بحرِ ناپیدا کنار میں کھڑے ہوئے ہمیں خشکی کا کوئی کنارہ دکھائی نہیں دیتا۔ کم از کم ہمارا "دل" اور ہماری "فطرت" تو اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ زندگی کا دائمی ذوق یقیناً قبر کے تاریک پردے کو چاک چاک کرتے ہوئے آسمانی بلندیوں کی طرف راستہ پیدا کرے گا۔

کیا تم دیکھتے نہیں کہ تیتری ایک چھلکے سے نکل کر کس طرح باغ میں ہر طرف رقص کرتی پھرتی ہے اور کیا تمہیں یہ معلوم کر کے کبھی خوشی معلوم

نہیں ہوئی کہ مرغی کا بچہ انڈے سے باہر آتے ہی رفتہ رفتہ زندگی کی وسعتوں سے لذت یاب ہونے لگتا ہے، موتی بھی صدف میں رہتے ہوئے گھبراتا ہے، پھر کیا انسانی روح ایک موتی سے بھی گئی گزری شے ہے"؟

طارق کہتا ہے کہ صاحب موت سے ڈرنا اور خوف کھانا تو کیا، ہم آیندہ لذات سے اس قدر سرمست ہیں، کہ اُسی کو لطفِ وصال اور تحصیلِ آرزو کا انتہائی مقام سمجھتے ہیں، آخر جب خیّام یہ کہتا ہے اور بجا طور پر کہتا ہے کہ کمہار کے ہاں جو کوزے تیار ہوتے ہیں، وہ فی الحقیقت انسان ہی کی جسمانی خاک سے تیار ہوتے ہیں[1] تو فرمائیے اس میں نقصان کیا رہا۔ کوزہ گر نے پھاوڑہ لے جا کر مٹی کھودی، اس میں آپ کے جسم کی بوسیدہ ہڈیاں بھی آگئیں۔ پھر انہیں لادا۔ اپنے گھر لایا، مٹی گوندھی اور چرخ پر چڑھا کر اس سے کوزے اور ساغر وغیرہ تیار کر دیئے پھر وہ ساغرِ عیش و عشرت کی رنگا رنگ مجلسوں میں پہنچے، وہاں پہنچے جہاں غیر کی رسائی ہی نہ تھی، نگاہ ترستی تھی مگر دیکھ نہ سکتی تھی۔ ہونٹ پھڑکتے تھے، مگر ان کی خواہش پوری نہ ہوتی تھی، اب انہیں ظروف میں

---

[1] مثلاً ؎

در کارگہِ کوزہ گرے بودم دوش   دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ہر یک بزبانِ حال با من گفتند   کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

لالہ رنگ شراب ہے، معشوق اُسے غٹا غٹ پئے جاتے ہیں، کبھی وہ اس پر ہونٹ چسپاں کرتا ہے اور لذت سے سرشار ہو جاتا ہے، کبھی یہ ہاتھ میں لیتا ہے، اس میں اپنا عکسِ رخ دیکھتا ہے اور خوشی سے پھولا نہیں سماتا، بھلا جس خاک کو مسرت کی یہ ہنگامہ آرائیاں نصیب ہوں، اور در ارتقا میں پہنچ کر یہ شرف حاصل ہو جائے، اس کے لئے گھبرانے اور بے تاب ہونے کی کون سی بات ہے ؎

گرچہ اسکندر رہا محروم آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ نا و نوش

(اقبالؔ)

جہانگیر گو ایک عرصہ تک اس زندگی کے ہنگامے دیکھ کر بالآخر گوشۂ لحد میں جا سویا، لیکن اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ اس کی روح کے نغمے ختم ہو گئے۔ اس کی مسرور طبیعت افسردہ ہو گئی، یا حسن کی نسبت وہ اپنے تصور کو زائل کر بیٹھا ہے، اس کی روح تو آج بھی زائرین سے پکار پکار کر کہے دیتی ہے کہ ؎

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

(غالبؔ)

آپ کہیں گے اس خاک سے پھول بھی تو پیدا ہوتے ہیں، ہاں صاحب ہوتے ہیں اور رنگا رنگ کے پھول پیدا ہوتے ہیں۔ مختلف

خوشبوئیں لئے ہوئے پیدا ہوتے ہیں، یہ اور بھی اچھی بات ہوتی کہیں آپ سہرا بنیں گے تو کہیں پیس کر آپ کا غازہ تیار کیا جائے گا۔ جب غازہ بن گئے، تو پھر آپ جانتے ہیں کہ اس کا اصل مقام کیا ہو گا؟ عارضِ جاناں ؎

گُل کو کیا اس کا الم ہو گا کہ وہ گُل نہ ہوا
ارتقا اس کو اگر عارضِ جاناں کر دے

(اکبرؔ)

خیر یہ تو ہوئی ایک عام روش، ایک رسمی چیز، اور بایں ہمہ اس قدر لذت بخش، اس قدر باقی، اس قدر رنگین مزاج، لیکن اب اسی سے اندازہ کیجئے کہ عاشقانِ حق اور خواص کی موت کا کیا حال ہو گا آیا اُسے موت کہنا بھی چاہیئے یا نہیں؟ سو ہم تو نہ پہلے اسے موت کہتے تھے اور نہ اب کہتے ہیں۔ کیا یہ زندگی کا انتہائی مقام نہیں کہ بعد الموت جسم زیرِ خاک رہنا گوارا ہی نہ کرے، اور روح کے ساتھ ہی ساتھ آسمان کی جانب پرواز کر جاتے؟

صاحب! آپ اس سوال پر خاموش کیوں ہیں، یہ خاموشی تو ایک غیر عادی بات سنکر تعجب کی وجہ سے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آج تک آپ نے کتنی غیر عادی باتیں سنی ہوں گی، جو ایک عرصہ تک آپ کے لئے نہ صرف ناقابلِ قبول بلکہ مضحکہ خیز بھی تھیں، لیکن جب مشاہدہ کی نوبت آئی، تو آپ ہی اُن کی تصدیق بھی کرتے تھے، ہوائی جہاز،

تار برقی، بجلی کے انڈے، انجن، موٹر کاریں اور فلم کی متحرک تصویریں تو اس کی ادنیٰ مثالیں ہیں۔

جب انسان اپنی تحقیق و تفتیش سے ایسی محیر العقول چیزیں پیدا کر سکتا ہے تو کیا روح کی غیر فانی قوتیں اپنے جذب و کشش سے جسم کو اوپر کی جانب اٹھا لینے پر قادر نہیں؟ یقیناً انہیں یہ اختیار حاصل ہے "عزت نفس" کی بنا پر یہ اختیار حاصل ہے اور یہ اختیار ایک ایسی پُر اسرار چیز ہے جو علم جرِ ثقیل کے موجدوں کی سمجھ میں نہ کبھی آیا تھا اور نہ آسکتا ہے۔

جبھی تو فرمایا ہے نا ؎

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفون دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے

غبارِ رہ گذر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد[1] پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

تو آپ ہی غور فرمائیے کہ ایسی مخصوص اور مقدس روح جس ڈھانچے

---

[1] نرم رو قاصد: مراد "دل" ہے۔

میں ایک مدت تک بسیرا کرچکی ہو، اُسے وہ دیگر حیوانوں کی طرح خاک میں ملنے دے گی؟ کیا وہ گوارا کرے گی کہ حشرات الارض میں سے جو شے آئے، اُسے حسب منشا اِدھر اُدھر گھسیٹ کر لے جائے. کیا اسے منظور ہوگا کہ اس کا رفیق کیڑوں مکوڑوں کی نذر ہو اور اس میں چند روز کے بعد تعفن پیدا ہو جاتے؟ نہیں اور ہرگز نہیں! یہ وہ توہین ہے جس کا مطالبہ کرنے میں وہ آسمان و زمین کو ریزہ ریزہ کر دے گی، مگر یہ حالت کبھی پسند نہ کرے گی، اس جرأت اور اس تسخیر کی مثال ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار ہیں. غور سے ملاحظہ فرمائیے سہ

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ!
می فتد بر مرگ آں مردِ تمام
مثل شاہینے کہ افتد بر حمام!
ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ
زندگی او را حرم از بیم مرگ!
بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگ او را می دہد جانے دگر!
او خود اندیش است و مرگ اندیش نیست
مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست!
بگذر از مرگ کہ سازد با لحد
زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد!

مرد مومن خواہد از یزدان پاک
آں دگر مرگے کہ بر گیرد ز خاک!
آں دگر مرگ انتہائے راہ شوق
آخریں تکبیر در جنگاہ شوق!

یعنی "بندگانِ حق موت پر یوں غالب رہتے ہیں، جیسے شیر ہرن کو اپنے پنجے میں دبوچ لے یا جس طرح ہوا میں اڑتا ہوا باز ایک ہی جست میں کبوتر کا کام تمام کر دے۔ بالفاظِ دیگر وہ بذاتِ خود موت کا شکار بننے کی بجائے الٹا موت کو اپنا شکار بنا لیتے ہیں، خوف و ہراس ان کے قریب بھی نہیں پھٹکتا، بلکہ وہ تسخیرِ کائنات اور حفظِ جان کی فکر میں لگے رہتے ہیں، پھر ان کی موت ہے کیا؟ یہی چند انفاس کا تبادلہ اور پھر وہی سیر، وہی جولانی، اور وہی بے نہایت پرواز۔ وہ خدا سے ایک ایسی موت کے خواستگار ہوتے ہیں، جسے خاک سے کوئی تعلق نہ ہو، اور جو لحد کو حقارت سے ٹھکرا دے۔ پس وہ موت مرد جو اپنے اندر اس قسم کی امتیازی خصوصیات رکھتی ہو، اور وہ نہیں جو عوام تک محدود ہے اور جس میں کتے بلے بھی انسان کے ساتھ مشترک ہیں۔"

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی بیان کردہ موت صرف "عشاق" ہی کو حاصل ہو سکتی ہے، یہ روح کی بیداری اور تجلیاتِ باطن کا انتہائی مستقر ہے اور یہاں خدا بھی اپنی مشیت کو بندے کی آرزو میں فنا کر دیتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا تھا ؎

عشق شنخونے زدن برلا مکاں
گور را نادیدہ رفتن از جہاں

اوّل تو حریم ذات تک پہنچنا ہی ہر کس و ناکس کا حق نہیں، چہ جائیکہ اپنی تمنا پوری کرانے کے لئے اس پر دھاوا بول دیا جائے، اور اپنے حکم کی تعمیل زور سے کرائی جاتے۔ بہر کیف یہ صحیح ہے کہ خدا نے عرش کو لرزا دینے والی ہستیاں بھی دنیا میں پیدا کی ہیں اور یہی اس کے لئے فخر و مباہات کا اصل سرمایہ ہیں۔

چنانچہ ان تمام باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زندگی روحانی اور جسمانی، ہر دو لحاظ سے غیر فانی چیز ہے، یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، مکان و زمان کی نہ یہ مقید رہی ہے اور نہ رہ سکتی ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

بایں ہمہ اسے محدود سمجھ لینا انسانی شرف کو مٹانا اور فطرتِ صحیحہ کو ضائع کرنا ہے۔

خاتمہ

وقت کا آخری فیصلہ

چوں من آفتاب ہستم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

وقت عدالت کی کرسی پر ایک حاکمانہ شان سے بیٹھا ہے۔ قوموں کی تقدیر کے پروانے اس کے بائیں ہاتھ میں ہیں اور فیصلے کا قلم دائیں ہاتھ میں، وہ بدستور لکھتا جاتا ہے، ہاں ـــــ قوموں اور ملکوں کے حالات پر ایک نظرِ غائر ڈالتے ہوئے ازل کے ناقابلِ تغیر قانون کے ماتحت قوموں کی زندگی اور موت کا فیصلہ ـــــ لکھتا جاتا ہے۔

بابل اور نینوا لٹ گئے، بغداد اور مصر کی روایتی شان خاک میں مل گئی۔ یونان اور روما کا تمدن اور عالیشان محلات برباد ہو گئے۔ کتنے

فرعون آئے، مظلوم اور کمزور لوگوں کے خون سے ہولی کھیلی، اور وقت نے نتیجہ کار ایک ٹھوکر سے انہیں عدم کے بحرِ ناپیدا کنار میں غرق کر دیا۔

آج قومیتِ اسلام خطرے میں ہے، خدا کا قانونِ امم کبھی بدل نہیں سکتا۔ اس نے تو واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ط

"خدا جان بوجھ کر کبھی کسی قوم کو تباہ و برباد نہیں کرتا۔ تا وقتیکہ ان کا اپنا کیرکٹر زندگی کے ہر شعبے میں پست نہ ہو جائے۔"

اور ساتھ ہی اُس نے تنبیہ بھی کر دی ہے کہ:

لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ط

"ہر قوم کے لئے زندگی کی ایک مدت متعین کر دی گئی ہے، جب اُس کا وقت گذر جائے، تو اُس کے اعمال و افکار خود بخود رو بہ تنزّل ہونے لگتے ہیں۔ قومی شیرازہ بکھر جاتا ہے اور اس طرح اُس کو عین وقت پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔"

اے قومیتِ اسلام! مجھے خدشہ ہے کہ مستقبل قریب میں کہیں تم ہی

اس فرمان کے مصداق نہ بن جاؤ۔

رو! اے چشمِ خوں فشاں، انسان کی عالمگیر ہوس پرستی پر رو، اخوّت کہاں ہے، محبّت کہاں ہے، ہمدردی اور خدا ترسی کہاں ہے، شرافت اور خودداری کو کون لوٹ لے گیا، آج ایک طرف دنیا میں امن اور سلامتی قائم کرنے کے لئے جمعیتِ اقوام علیحدہ مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں، لیکن دوسری طرف سلاطین[1] سر سے سر جوڑ کر مشورہ کرنے بیٹھتے ہیں کہ بے چارہ اور ناکس قوموں کو کس طرح زیادہ آسانی سے تباہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زہریلے گیس عنقریب فضا میں پھیل کر آباد سرزمینوں کو قیامت کا نمونہ بنا دیں گے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس تمام بدامنی کا واحد سبب سرمایہ کی قلت ہے کوئی کہتا ہے کہ عیش و عشرت کے حد سے بڑھے ہوئے اسباب نے انسان سے اطمینانِ قلب چھین لیا۔ کوئی گویا ہوتا ہے کہ مردم شماری میں غیر معمولی اضافہ ہو جانے سے نظامِ دنیوی کا پیمانہ چھلک گیا۔ کسی کا خیال ہے کہ سرمایہ داری کے ناجائز دباؤ نے زندگی اور انسانیت کے مشترک حقوق چھین لئے ——— لیکن میں خدا کی آواز میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ صرف عمل کی خرابی اور باہمی مواسات کے فقدان نے ہم پر یہ تمام مصیبتیں نازل کی ہیں۔ بس:

---

[1] برطانیہ

ظھر الفساد فی البر و البحر بما کسبت
ایدی الناس لیذ یقھم بعض الذی عملوا
لعلھم یرجعون ط

"بر و بحر میں فساد اور ابتری فقط اس وجہ سے پھیلی ہے کہ تمہارے چال چلن بگڑ گئے۔ اور ہم ان حالات کو تمہاری پریشانی کا باعث اس لئے بنا رہے ہیں کہ اب بھی تم اپنی اصلاح کر لو اور سرکشی و طغیان سے باز آجاؤ۔"

میں کہتا ہوں کہ کہاں رہے گی غربت جب زکوٰۃ و امداد کا باضابطہ طریقہ جاری ہو جائے گا۔ کہاں رہے گا تعیش، جب بندے ریاکاری اور کبر و نمود سے کنارہ کش ہو کر خدائے ذوالجلال کے آستانے پر جھک جائیں گے۔ اس وقت کون محسوس کرے گا سرمایہ داری کو، جب حقوق کی سوشل اور مساویانہ تقسیم[1] ہو گی ـــــــ
اس لئے آج آؤ اور اپنی تمام مشکلات کا حل قدرت کے حکیمانہ

---

[1] حقوق کی سوشل تقسیم سے میری مراد آپس کی ہمدردی اور امداد باہمی ہے۔ میں اشتراکیت کی سخت پابندیوں کا حامی نہیں۔ کیونکہ اس طریق کار سے انسان کی فطری قوتوں کو ضعف پہنچنے کا اندیشہ ہے۔
طارق

قوانین میں تلاش کرو۔

اے برادرانِ ملت! کیا خدا کی یہ مشفقانہ دعوت ہماری محبت اور التفات کو جذب کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ:

الم یان للذین امنوا ان تخشع قلوبہم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیہم الامد فقست قلوبہم وکثیر منہم فاسقون ط

"کیا مسلمانوں کے لئے اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ اور اس کے حکموں کے آگے جھک جائیں اور اپنی غفلت ونافرمانی سے باز آئیں؟ اور اُن لوگوں (یہود ونصاریٰ) کی طرح نہ ہو جائیں جن کو مسلمانوں ہی کی طرح کتابِ الٰہی دی گئی تھی، لیکن جب ایک بڑی مدت گذر گئی تو غفلت میں رہتے رہتے ان کے دل سخت ہو گئے، احساس جاتا رہا، غیرت وحمیت مٹ گئی۔ سچے دلوں کی وہ نرمی اور اثر پذیری نہ رہی۔ جو صدائے حق سنتے ہی چونک اٹھتی ہے۔"

قوانین، اور ایک متحدہ قومیت کی تلاش ______؟ آہ! آج تک آپ نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ دنیا میں کوئی قوم اس وقت

تک قومی شعار اور قومی حقوق کو حاصل ہی نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اس کے افراد اپنے اپنے دل میں خود اعتمادی، عزتِ نفس اور حیاتِ ملّی کے جذبات محسوس نہ کرنے لگیں۔

پھر عصبیت اور نسل کو گو عام طور پر مذموم خیال کیا جاتا ہے لیکن سچ پوچھو تو دنیا کی کسی معمولی سی جماعت کا وقار اور استقلالِ ذاتی بھی "عصبیت" کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چہ جائیکہ اسلام جیسی صادق اور ازلی و ابدی حقیقت کا ذکر کیا جائے۔ چنانچہ اسی چیز کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء
علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاً
سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناط
سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ط
ذالک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی
الانجیل ط

"محمد خدا کا سچا نبی ہے، اور اس کے پیروکار آپس میں تو بے شک ہمدردی اور انس و الفت سے وقت بسر کرتے ہیں، مگر کافر اور منکر لوگوں کے لئے وہ نہایت جابر اور سخت گیر واقع ہوئے ہیں، تم دیکھو گے کہ شب و روز عبادت میں مشغول رہتے ہوئے وہ اپنے

پروردگار کا فضل اور کرم ڈھونڈتے رہتے ہیں۔
نمازوں کی وجہ سے ان کے ماتھوں پر سجدے کے
نشان پائے جاتے ہیں، یہ ان کی وہ علامت ہے جس
کا ذکر ہم نے اپنی دو کتابوں یعنی توراۃ اور انجیل میں
بھی کیا تھا۔"

بہر کیف، ہم ان صفاتِ حمیدہ کی تحصیل سے ناامید نہیں ہیں۔ ایک رہٹ کی مانند قوموں کی تقدیر کا چکر جاری ہے، کبھی کوئی حصہ نشیب میں چلا جاتا ہے۔ اور کبھی کوئی ملت اسلامیہ اگر اس وقت نشیب میں ہے، تو اس میں افسوس یا رنج کی کون سی بات ہے؟ یہ نشیب بھی درحقیقت ایک ایسی پیش آنے والی سرفرازی اور ایک ایسے عروج و اقبال کے لئے ہے جس کی نظیر یقیناً تاریخِ عالم کے صفحات میں نہیں مل سکتی۔

ہم مانتے ہیں کہ روحِ ملت ذرا دیر کے لئے سستانے کو خوابیدہ ہو گئی ہے۔ لیکن ہم یہ ہرگز تسلیم نہیں کرتے کہ یہ بالکل فوت ہو گئی ہے۔ یہ دوبارہ جاگے گی۔ اور اس شان سے جاگے گی، کہ کائناتِ عالم کا ذرّہ ذرّہ اس کی عظمت کے سامنے سر جھکا دے گا۔ جس طرح گرمی کا تڑپا دینے والا حبس، اور ہواؤں کی خاموش بندش اک عظیم الشان اور ہیبت ناک طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح فرزندانِ توحید صفحۂ دہر سے باطل کا نقش مٹا دینے کی تیاری

کر رہے ہیں۔

آؤ کہ ہم اس برگزیدہ مقصد کی جلد از جلد پیروی کریں، اور وقتِ سعادت کی یہ مہر ہماری پیشانیوں پر چسپاں کر دے ۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"
تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی
وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی
ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

میرے محترم دوستو! عروج اور تنزل، بلندی اور پستی، کامیابی اور ناکامی، عزّت اور ذلّت، نیک چلنی اور بداطواری کا یہی فلسفہ ذہن نشین کرنے کے لئے عربوں کے اُس دورِ بربریت پر نظر ڈالو، جبکہ وہ ابھی اسلام جیسی نعمت سے مشرف نہیں کئے گئے تھے۔

دینِ ابراہیمی موجود تھا، مگر ایک بے خوف، حق پسند، اور مخلص رہنما کے موجود نہ ہونے سے اس کی روشنی دلوں میں ماند پڑ گئی تھی۔

ازل کا وہ پیمان جو "بلیٰ" کہہ کر پختہ کیا گیا تھا، ہوا و ہوس کی قربان گاہ پر نثار کیا جا رہا تھا۔ دل اپنے معبود کے سامنے جھکنے کے لئے بے تاب تھے، مگر انہیں اس فعل کے لئے قدرت کی طرف سے ایک معمولی سی تائید درکار تھی۔ ہاں یہ سب کچھ تھا کہ یکایک ؎

یہ چالیسویں سال لُطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

— یہ چاند نکلا، اس کی ضیا پاشیوں سے دنیا کا کونہ کونہ منوّر ہوا۔ اور دل پیامِ حق سے بیدار ہو گئے۔ یہ چاند وہ چاند نہیں تھا۔ جو اپنے دورانِ عمل کے لئے دنوں اور مہینوں کا پابند ہوتا۔

یہ چاند وہ چاند نہیں تھا، جو کبھی نہ کبھی گہن کی نذر ہو سکے۔ یہ چاند وہ چاند نہیں تھا جو ہلال یا بدر کی مانند گھٹ اور بڑھ سکے ـــــــ بلکہ یہ وہ چاند تھا جو ہر ممکن نشیب و فراز سے بالاتر رہتے ہوئے اپنی مکمل اور اکمل صورت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یکساں طور پر تاباں ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ
نَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ
سِرَاجًا مُّنِيْرًا ط

"اے نبی! ہم نے تجھے اپنی توحید اور یکتائی کا گواہ بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ پس ہمارے وفادار اور مطیع بندوں کو نجات کی خوش خبری سنا۔ نافرمانوں کو خدا کے عذاب سے ڈرا۔ اور راہِ راست کی طرف دعوت دے، کیونکہ تو ایک ایسا روشن چراغ ہے جو اپنے نور سے دوسروں کو برابر فیض پہنچا تا رہے۔"

اس لئے میں بہ طورِ فیصلہ یہ کہتا ہوں کہ اے مقتدایانِ ملّت! اور اے قوم کی تباہی اور ذلّت و نکبت کا رونا رو کر ذاتی اعزاض کو پورا کرنے والے ملّاؤ! اپنی اس غیر ذمہ دارانہ روش سے باز آجاؤ۔ گلے کی رگیں پھلا کر مسلمانوں کو کوسنا

اور لعن طعن کرنا چھوڑ دو۔

یاد رکھو! کہ قومی سپرٹ کی بربادی کا خون زیادہ تر تمہاری گردن پر ہے۔

یزید کے وقت سے لے کر آج تک کی تاریخ نے تمہاری نسبت کوئی حوصلہ افزا اور مفید ریکارڈ نہیں چھوڑا۔

تمہارے پے در پے وعظ کے مطابق خدا گناہوں کی وجہ سے بے شک انسانوں کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔ لیکن اُس عذاب سے زیادہ تمہارا وجود، اور تمہاری تفرقہ انگیز تعلیم قوم کے اتحاد اور ملّت کی شیرازہ بندی کے لئے خطرے کا باعث بن گئی ہے۔

تم جماعتوں کو اس بات کا خوف دلاتے ہو کہ قوم دن بدن مر رہی ہے، تم جرأت آفریں اور تسلّی بخش الفاظ کے استعمال میں بخل کرتے ہو، لیکن میں تاریخِ عالم کے نفسیاتی اسباب پر بالعموم اور چودہ سو سال پہلے کی اسلامی تاریخ پر بالخصوص نظر دوڑاتے ہوئے پورے وثوق کے ساتھ اس حقیقتِ صادقہ کا اعلان کرتا ہوں کہ ہمارے لئے اس سے زیادہ خوشی اور مسرت کا اور کوئی دور آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اب ہم ایک مبہم اور نا معلوم طور پر اپنی اپنی جگہ ایسے شاندار مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں

جس میں دور سے کامیابی، عزت واقبال اور جبر واختیار کے
فرحت انگیز ڈنکے صاف سنائی دے رہے ہیں ؂

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ختم شد